اِقرا

شعری مجموعہ

رؤف خلیل
بی۔اے (عثمانیہ)

بہ اشتراک اُردو اکیڈیمی آندھرا پردیش
حیدرآباد۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝

اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝

الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ۝

پڑھو اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا، جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔
پڑھو اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا، انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔

(قرآن)

(سورۂ علق، ۹۶، تفہیم القرآن جلد ۶)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

امانت آنے والی ساعتوں کی

ایک پرچھائیں سی اُبھری تھی
سرِ غارِ حرائے جاں
کہ جس نے عہدِ جہلِ لفظ کا ادراک بخشا
عطا کی سارے دہرائے ہوئے لہجوں سے توفیق بغاوت
مرے سینے کو چیرا
اپنی بے جسم انگلیوں سے اس میں کوئی چیز رکھ دی
بڑے فرسودہ ذہنوں میں مجھے مبعوث کر کے
امانت سونپ دی سب آنے والی ساعتوں کی
خود کہیں گم ہو گئی

۱۳ر جون ۱۹۷۱ء

انتساب

ننھی منّی پیاری پیاری **ایلاف خیری**

سرتاپا مسلمان راشدہ عبدالحفیظ

اور

مجتبیٰ و محبوبی سیّد عبدالقیوم

محسنِ خیر محمد بہاؤالدین صاحب

کے نام

بار اوّل

سنِ اشاعت : ۹ر جون ۱۹۷۷ء

تعداد : ایک ہزار

کتابت : ادارۂ "گل نو"، ۲۶۲۴، پرانی حویلی، حیدرآباد ۰۰۲-۵۰۰

طباعت : اعجاز پرنٹنگ پریس، چھتہ بازار، حیدرآباد ۲-۰۰۵۰۰

قیمت : دس روپے

پبلیشر : گل نو پبلیکیشنز، ۲۶۲۴، پرانی حویلی، حیدرآباد ۰۰۲-۵۰۰

ملنے کا پتہ :

۱۔ گلِ نو پبلیکیشنز، ۲۶۲۴، پرانی حویلی، حیدرآباد ۰۰۲-۵۰۰

۲۔ مکتبہ نشاۃ الثانیہ، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ۰۰۱-۵۰۰

۳۔ اُردو اکیڈیمی بک ڈپو، روپیہ والے۔ جی آفس، خیریت آباد، حیدرآباد ۰۰۴-۵۰۰

۴۔ الیاس بک سیلرز، شاہ علی بنڈہ، حیدرآباد ۰۰۲-۵۰۰

اور

رؤف خیر، ۶۲۵، الادہ پنج بھائی، کاروان، حیدرآباد ۰۰۶-۵۰۰، آندھرا پردیش، بھارت

سچّے تجربے کے معتبر اظہار کا شاعر ___ رؤف خیر

گزشتہ دس برس میں حیدرآباد نے کئی نئے خوشگو شاعر پیدا کیے ہیں۔ شاعری اور افسانے میں حیدرآباد سے نئے لکھنے والوں کی ایک پوری نسل آزادی کے فوری بعد کے برسوں میں ابھری تھی جس نے جدید اردو ادب کی نئی سمتوں کے تعین میں نمایاں کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس کے بعد ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے یکایک اچھے ادیبوں کے ابھرنے کے لیے حالات نامساعد سے ہو گئے ہیں۔ لیکن نئے اذہان کی تخلیقی صلاحیتوں نے اس اندیشے کی بھرپور تردید کی۔ حیدرآباد میں تخلیق کے چراغ اب بھی روشن ہیں۔ اِن چراغوں میں کئی ایسے ہیں جو ادب کے ایوان کو وقت گزرنے کے ساتھ زیادہ منور کر سکتے ہیں اِس جدید تر نسل میں رؤف خیر ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں لہجے کی انفرادیت کے

ساتھ موضوعات کا تنوع، عصری حسیت، زبان و فن پر ریاض اور شعر سے والہانہ شیفتگی کے وہ عناصر ملتے ہیں جو ان کے تابناک مستقبل کی ضمانت ہیں۔

شاعروں کے ہجوم میں معدودے چند ہی ایسے ہوتے ہیں جو اپنی اولین تخلیقات ہی سے باشعور اور فن شناس قارئین کو متوجہ کرلیں۔ رؤف خیر کی نظموں اور غزلوں میں ابتدا سے چونکانے اور متوجہ کرنے والی کیفیت تھی۔ ایک چونکانا تو محض سنسنی خیزی اور سستی شہرت کے لئے ہوتا ہے۔ ان کے یہاں چونکانے کی یہ کیفیت ان کے اسلوب کی تازہ کاری نے پیدا کی ہے وہ شعر کے وسیلۂ اظہار یعنے لفظ کا احترام کرنا بھی جانتے ہیں۔ اس لئے لفظ ان کے یہاں بے جان اور پامال نظر نہیں آتے۔ ان کا طرز احساس، ذہنی رویہ اور زبان کو برتنے کا انداز نیا ہوتے ہوئے بھی کلاسیکی آداب کا پاسدار ہے۔ اِس سے منقطع اور منحرف نہیں۔

اس دہے کے بیشتر جدید شعراء کی سہل انگاری نے غزل کے غیر سنجیدہ لہجے اور قافیہ و ردیف کے نئے پن ہی کو جدیدیت سمجھ لیا ہے۔ اسی طرح نظم میں چند پٹے پٹائے موضوعات کو سکہ بند اظہارات میں اکتا دینے والی یکسانیت کے ساتھ باندھتے رہنا بھی نئے پن کا شناسنامہ سمجھا جانے لگا ہے۔ رؤف خیر کی احتیاط پسندی اور تخلیقی صلاحیت نے

غزل اور نظم دونوں اصناف میں اس بھیڑ چال سے گریز کرکے
اُن کے آداب کو ملحوظ رکھا اور انھیں سچے تجربے کی زبان
دی ہے۔ کسی بھی نئے شاعر کے یہاں یہ رویہ ایک فنی پختگی اور تخلیقی
خلوص کی علامت ہے۔ رؤف خیر کی غزل اور نظم دونوں یکساں
طور پر توجہ کی طالب ہیں۔ فن کے ساتھ یہ سنجیدہ رویہ یقین دلاتا
ہے کہ مستقبل میں اُن سے امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔
رؤف خیر ایسے شاعروں کا منصۂ شہود پر آنا اردو شاعری کی زندگی
کی روشن علامت ہے۔ مجھے امید ہے کہ ان کا تخلیقی سفر اسی
محتاط اور پر خلوص انداز میں سچے تجربے کے معتبر اظہار کی صورت
میں جاری رہے گا۔

ڈاکٹر وحید اختر
شعبۂ فلسفہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

۶ اگست ۱۹۷۶ء

کچھ کتابِ جاں کے بارے میں

اپنے بارے میں افراط و تفریط سے بچ کر کچھ کہنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ اِس لئے میں نے بہتر جانا کہ اپنے آپ کو اس سے بچائے رکھوں اور پھر میرا کلام خود میرا تعارف ہے۔

میری تخلیقات، جو ہر صاحبِ ذوق کے لئے ہیں واقعتاً انسان اور کائنات کے بارے میں میرے احساسات اور میری رائے کا منظم اظہار ہیں۔ مجھے خوشی ہوگی اگر صاحبِ الرّائے حضرات میرے اِس پہلے شعری مجموعے "اقرا" کے بارے میں اپنے گرانقدر خیالات سے آگاہ فرمائیں۔

میں اُردو اکیڈمی آندھرا پردیش حیدرآباد کا مالی امداد کے لئے ڈاکٹر وحید اختر صاحب کا انکی رائے کیلئے، اور جناب سعید بن محمد نقش صاحب کا سرورق کے ڈیزائن کے لئے شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں اس کے علاوہ ادارہ "گل نو" کی مساعیٔ جمیلہ کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے جنکی مخلصانہ کوششوں کے بغیر "اقرا" کا یہ رنگ روپ نہ ہوتا۔

اور جناب انور نظامی صاحب، جناب رحمٰن جامی صاحب، جناب مصلح الدین سعدی صاحب، جناب وقار خلیل صاحب، جناب قطب سرشار صاحب اور اقلیم ادب کے بانیان واراکین کا خلوص میرے ساتھ رہا جس کے لئے میں سراپا سپاس ہوں۔

رؤف خیر

نورِ مستند

(نعت)

کیا تھا کس نے گھنی تیرگی کو رد کہیئے
وہ آدمی کہ جسے نورِ مستند کہیئے

وہ اک جنوں کہ جہاں سرنگوں خرد کہیئے
جو ماہتاب کو چھو لے وہ جذر و مد کہیئے

وہ شام جسکو ملا شہپرِ چراغ کا درد
وہ صبح جس پہ نثار آفتاب صد کہیئے

وہ جسکی راہ میں حائل نہ ہو سکے بونے
اسے شعورِ مکمل "نگاہ قد" سے کہیئے

زمیں کو بخش دیئے اس نے آسماں کے راز
اب اور رہ گئی کیا جستجو کی حد کہیئے

وہ نیک خو کہ بھلا چاہتا رہا سب کا
تڑپ کے رہ گئی کیا کیا نگاہِ بد کہیئے

کوئی شعورِ حیات اس سے گر نہیں لیتا
اُسے شعورِ نظر ہی سے نابلد کہیئے

ملیں گے یوں تو کئی راستے میں صدر اہے
جو اس کی راہ نہیں، راہِ مسترد کہیئے

صدائے خضر سنیں طالبانِ منزلِ نور
قدم اکھڑنے لگے ہوں تو المدد[1] کہیئے

[1] المدد کا لفظ صرف خدا کے لئے مخصوص ہے۔ یہاں میری بھی یہی مراد ہے۔

نہ جہلِ شرک، نہ بدعت، نہ غالیوں کا غلو
میں حق پسند ہوں، میری نظر میں بھی تم ہو

جہاں میں ہم اسی اعزاز سے معزّز ہیں
ہمارے ساتھ تو ہر خشک و تر میں بھی تم ہو

حیات و موت کی منزل تمہارے نام سے ہے
کہ مبتدا میں بھی تم ہو خبر میں بھی تم ہو

یہ جنّ و انس، یہ جنگل، یہ دشت و ریگ رواں
ہر ایک نفسِ حقیقت اثر میں بھی تم ہو

عجب تعلق خاطر تمہاری ذات سے ہے
کہ منزلوں پہ بھی تم، رہگذر میں بھی تم ہو

جو داعیانِ نبوّت تھے خاک ہو کے رہے
دلوں میں نورِ خدا ہو تو سر میں بھی تم ہو

یہ پُل صراط، یہ ظلمت، یہ نور کی منزل
خدا کا شکر ہے اس رہگذر میں بھی تم ہو

عبادتیں ہوں کہ جنگ و جدل ہو جو کچھ ہو
ہمارے خیر میں بھی تم ہو شر میں بھی تم ہو

غزلیں

۲۱ مئی ۱۹۷۷ء

ابھی نگاہ کو پیغمبرانہ ہونا ہے
کہ فلسفوں کو ابھی عامیانہ ہونا ہے

میں ایک پودا ہوں ملبے میں سانس لیتا ہوا
کہ اس کھنڈر میں مجھے بھی خزانہ ہونا ہے

عجب پرندہ ہے ہر زد سے بچ نکلتا ہے
پتہ نہیں اسے کس کا نشانہ ہونا ہے

ہمیں اندھیرا ہیں، یہ طے ہے آپ سورج ہیں
ہمارا ہونا مگر آپ کا نہ ہونا ہے

میں چپ نہیں ہوں کہ اس دور ابتلا میں مجھے
حریفِ خامشیِ مجرمانہ ہونا ہے

سنو یہاں سے مرے دوستو اجازت دو
مجھے تلاش میں اپنی روانہ ہونا ہے

بھلا دیا ہے کسی نے تو کوئی غم نہ کرو
ہر ایک شخص کو اک دن فسانہ ہونا ہے

رؤف خیر چلو یہ بھی اب غنیمت ہے
بھلائی کہتے ہیں جس کو بُرا نہ ہونا ہے

۷ر جون ۱۹۷۶ء

اس سیلِ بے اماں کا بہاؤ بھی مان لو
پھر مجھ کو ایک نوح کی ناؤ بھی مان لو

یہ چوبِ آتش یہ دھوئیں کی گواہیاں
جنگل میں قافلے کا پڑاؤ بھی مان لو

تاپے اگر ہیں ہاتھ تو دل بھی اجالتے
جب آگ مان لی ہے، الاؤ بھی مان لو

خالی مکان دیکھ کے آسیب گھس نہ جائیں
پردیسیو پلٹ کے اب آؤ بھی مان لو

یہ اور بات ہے کہ اُسے ہم نے طے کیا
آیا تمھارا ستے میں چڑھاؤ بھی مان لو

ہر بات کا ثبوت نہ مانگا کرو یہاں
کچھ بے نشان ہوتے ہیں گھاؤ بھی مان لو

وہ تو کھلی کتاب ہے اے کافرانِ خیر
ایمان اک رسول پہ لاؤ بھی مان لو

جنوری ۱۹۷۵ء

چراغ جیسے ہیں لمحے کئی بھنورتے ہوئے
جو احتجاج نہیں کرتے گھاٹ اترتے ہوئے

افق کو دیکھوں تو اسکی سپردگی یاد آئے
اب ایک عمر لگے گی اُسے بسرتے ہوئے

مٹے کہاں ہیں دھنک بن کے اور ابھرے ہیں
کہ ہم نے رنگ بکھیرے بہت بکھرتے ہوئے

ہر ایک پیڑ کا سایہ گھنا نہیں ہوتا
سفر طویل تھا ٹھیرے نہ ہم گزرتے ہوئے

یہ اک خرابہ سہی راس آہی جائے گا
جلائیں کشتیاں یاروں نے پار اترتے ہوئے

میں سو رہا تھا کہ اب جاگنا نہ تھا بس میں
یہ نیند اچٹتی ہوئی اور خواب مرتے ہوئے

ہمیں یہ رات ہے بھاری ہمیں یہ دن ہے کٹھن
حیات کٹتی ہے اپنی جہاد کرتے ہوئے

بجائے خود ہے اذیت یہ ٹوٹتا نشّہ
سمندروں کو نہ دیکھو کبھی اترتے ہوئے

ہمارے قامت زیبا پہ حرف رکھتے ہیں
وہ جن کی عمر کٹی آئینے سے ڈرتے ہوئے

بلا سے چیخ بنو، حرف زیر لب نہ بنو
کوئی نشان تو چھوڑو کہیں گزرتے ہوئے

ہمیں بھی حسب ہنر خود کو آزمانا تھا
غمِ حیات کے مضمون تھے نکھرتے ہوئے

۱۵ مئی ۱۹۷۶ء

منظر ہوں میں، گھرا ہوا، پس منظروں میں ہوں
میں کب سے بُت بنا ہوا اِن پتھروں میں ہوں

جو بے کتاب ہیں انہی پیغمبروں میں ہوں
یعنی ابھی دلوں میں نہیں ہوں سروں میں ہوں

میں بد سرشت کب سے تماشہ گروں میں ہوں
اک حسرتِ دعا کی طرح ممبروں میں ہوں

میں لذتِ زوال کی خاکستروں میں ہوں
آکاش میں نہیں ہوں شکستہ پروں میں ہوں

یہ اور بات ہے کہ مرا گھر نہیں کوئی
اب تم سے کیا کہوں کہ میں کتنے گھروں میں ہوں

اک دائرے سے چھوٹوں تو اک اور دائرہ
اے گردشِ حیات یہ کن محوروں میں ہوں

۳۰ مارچ ۱۹۷۶ء

ہمارا مول تو جیسے رہا سہا بھی گیا
گئی تھی جان مگر اب تو خوں بہا بھی گیا

پنپ رہا تھا جو مجھ میں وہ اژدہا بھی گیا
نہ ڈس سکا تجھے ڈسنے جو بار ہا بھی گیا ؎

یہ بات جھوٹ سی لگتی ہے آج تیرے بغیر
رہا نہ جاتا تھا ہم سے مگر رہا بھی گیا

ہمارے لوٹ کے آنے کا انتظار نہ کر
ہمیں ہوا کے بہاؤ پہ جب بہا بھی گیا

کوئی نظر مجھے کیا قتل کر سکے گی کہ میں
ترے لعابِ دہن میں نہا نہا بھی گیا

چلی ہوائے ابابیل ہاتھیوں کے خلاف
جو آیا کعبۂ دل ڈھانے ابرہہ بھی گیا

ہماری چشم گنہگار سے گئے آنسو
تمہارے ہونٹوں سے کیوں رنگِ قہقہہ بھی گیا

؎ یہ قافیہ عمداً استعمال کیا گیا ہے۔

ایک اک موڑ پہ اک دیو کھڑا ہے، میں ہوں
میرے ہاتھوں میں بھی تلوار اُنا ہے، میں ہوں

ٹوٹتا نشّہ ہے، یاروں کو گلہ ہے، میں ہوں
ہائے کس وقت یہ محسوس ہوا ہے، میں ہوں

جی رہا ہوں کہ مری بات ادھوری ہے ابھی
ایک بے انت کہانی کی بنا ہے، میں ہوں

اِس خرابے میں فسادات کے اندیشے سے
چھپ کے بیٹھا ہوا اک مجھ میں خدا ہے، میں ہوں

زندگی زہر ترا کام نہ کر پائے گا
جس نے بے تیشہ زہر اب لیا ہے، میں ہوں

کوئی آئے تو سہی، کوئی بلائے تو سہی
خیر بے چہرہ سی دستک کی صدا ہے، میں ہوں

۱۴ر جولائی ۱۹۷۵ء

پیش ہیں مثبت و منفی کے دوراہے میں ہوں
دیکھنا یہ ہے کہ کس طرح نباہے میں ہوں

تو کہیں یہ نہ سمجھنا سرِ راہے، میں ہوں
واقعہ یہ ہے ترا درد نباہے، میں ہوں

کوئی جچتا ہی نہیں آنکھ میں عالم وہ ہے
گاہے تو ہے مرے آئینے میں گاہے میں ہوں

تجھ کو یہ وہم ترے قتل کے درپے ہیں تھا
رکھ رہا ہے جو ترے زخم پہ پھاہے، میں ہوں

خیر طوفانی ہواؤں کے تھپیڑوں سے پرے
ریت پر لیٹا سمندر کو سراہے، میں ہوں

۱۴ر فروری ۷۳ء ۱۹

کچھ جہدِ زندگی کی نشانی بھی ہم میں تھی
دنیا سراب تھی تو روانی بھی ہم میں تھی

جی کو بری لگی نہ کسی بدگماں کی بات
کیا کیجیے کہ نیک گمانی بھی ہم میں تھی

ہر بے جواز بات پہ کرتے نہ تھے یقین
گویا جہالتِ ہمہ دانی بھی ہم میں تھی

اب ہم ہیں اور جینے کا معمول ہے وہی
کچھ دن پیمبروں کی نشانی بھی ہم میں تھی

کچھ کھل گیا تھا ہم سے وہ محتاط شخص بھی
لگتا ہے کوئی بات سہانی بھی ہم میں تھی

اس احتیاطِ لفظ نے گونگا بنا دیا
سچ پوچھیے تو فکرِ معانی بھی ہم میں بھی

ساحل پہ اب ہیں خیر خزف ریزے کیطرح
ہائے سمندروں کی جوانی بھی ہم میں تھی

۲۲ رفروری ۱۹۷۴ء

مجھے وہ سونپ کے کیا لمسِ بے مثال گیا
اک آرزو کسی دلدل میں جیسے ڈال گیا

ہر ایک شخص ہے بے پارہ آئینے کی طرح
کہاں کہاں نہ کوئی صورتِ سوال گیا

نہ دن کو دھوپ نہ راتوں کو اوس تا منظر
میں اس کی ذات کا صحرا ابھی سب کھنگال گیا

یہ روز و شب کوئی بچہ پھرائے جیسے گلوب
یہ خط و خال سے جاتا کہ ایک سال گیا

وہ اپنے خول سے باہر کہاں نکلتا تھا
مگر بدن کا تقاضہ اُسے نکال گیا

۲۵ مئی ۱۹۷۴ء

خرد کی بات سے تھا یا جنوں کے ہاتھ سے تھا
لہو لہو وہ کسی تازہ واردات سے تھا

تمہیں یہ وہم اشارہ تمہاری ذات سے تھا
غلط نہ سمجھو مخاطب میں کائنات سے تھا

نہ اب وہ جہل نہ دانشوروں کی باتیں ہیں
کہ حسنِ فلسفہ حسنِ تنازعات سے تھا

فسادِ شہر نہ تھا بے سبب کہ ربط اس کا
معاشیات سے تھا یا سیاسیات سے تھا

سحر کو بادِ صبا نے مجھے بکھیر دیا
میں اپنی خاک سنبھالے ہوئے تو رات سے تھا

بچا ہوا سے تو دھولوں کی زد میں آ کے گرا
وہ برگِ سبز جو موسم کی باقیات سے تھا

وہ مر گیا تو خدا ہو گیا ہزاروں کا
وہ شخص اپنے ہی جیسا تھا جب حیات سے تھا

ترا خیال ہے اک پیرِ تسمہ پا مجھ کو
تجھے خبر بھی ہے کیا کیا میں اپنی ذات سے تھا

رؤف خیر تعلق شروع سے اپنا
جمالیات سے تھا حسنِ شعریات سے تھا

۲۰ فروری ۱۹۷۱ء

کسی کے سنگِ ملامت سے اور حسد سے بچاؤ
مجھے جنوں سے بچاؤ، مجھے خرد سے بچاؤ

میں ابر ہوں مجھے یوں بھی کہیں برسنا ہے
مگر خدا کے لئے دشتِ نابلد سے بچاؤ

بہت دلوں میں سلگنے کا طرز آیا ہے
چراغِ جاں ذرا پاگل ہوا کی زد سے بچاؤ

میں بے لباس ہوں اب اے شکستہ دیوارو
مجھے ملامتِ شہرِ دراز قد سے بچاؤ

یہاں تو جو بھی ہے بھٹکا ہوا ہی لگتا ہے
کہوں میں کس سے مجھے راہِ مسترد سے بچاؤ

مرا وجود مرے دور کا تقاضہ ہے
مجھے خدا کے لئے قاتلوں کی زد سے بچاؤ

میں اک جزیرہ ہوں تم ماہتابِ کامل ہو
گھرا ہوا ہوں سمندر کے جزر و مد سے بچاؤ

کہا کرو نہ لہو صرف کر کے خیرِ غزل
خدا کے واسطے خود کو نگاہِ بد سے بچاؤ

۱۶ر فروری ۱۹۷۱ء

میں کیا کروں کسی سے اگر یہ سہا نہ جائے
آنکھیں جو دیکھتی ہیں وہ کیوں کر کہا نہ جائے

پاگل مری طرح کوئی خوں میں نہا نہ جائے
یادوں کا اِس طرف سے کوئی اژدہا نہ جائے

اٹھی تو اپنے ساتھ بہا لے گئی مجھے
پیاس ایک رو ہے جس کے مخالف بہا نہ جائے

دل کی شکستگی ہے کہ اک رازِ قتل ہے
خود سے سہا نہ جائے کسی سے کہا نہ جائے

ہم نے بھلا دیا تو ہے تجھ کو مگر کبھی
تو یاد آ گیا تو یہاں پھر رہا نہ جائے

حساس ہے وہ شخص بہت رو نہ دے کہیں
اس تک خلاف اس کے کوئی قہقہہ نہ جائے

پچھلے پہر سے خیر ہوا تیز ہے بہت
اب جاگتے رہو یہ کوئی گھر ڈھا نہ جائے

۲۵ر اکتوبر ۱۹۷۱ء

میں سنگ زارِ انا ہوں، تراش دو مجھ کو
کوئی حسین سا آذر تلاش دو مجھ کو

تم اپنے آپ کو محروم نغمگی نہ کرو
میں تارِ جاں ہوں سنو، ارتعاش دو مجھ کو

ستا رہی ہے بہت خود کو دیکھنے کی ہوس
انا کا آئینہ پاش پاش دو مجھ کو

اسی حیات میں نکھرا ہوا جنم لے لوں
تم اپنی ذات میں گر بود و باش دو مجھ کو

مرا عروج، مری لذت زوال میں ہے
شکست و ریخت کے لمحے کی کاش دو مجھ کو

ڈبو دیا ہے بہت ناگنوں نے ڈس ڈس کے
جو زہر چوس لیں وہ لب تلاش دو مجھ کو

گزر رہا ہوں ابھی تک تو خود تراشی سے
کہاں ہیں دستِ ہنر ہوں، تراش دو مجھ کو

گیا وہ دور کہ غالب وظیفہ خواروں میں تھا
غزل کہوں جو سکونِ معاش دو مجھ کو

۱۹۷۴ء

یہ سچ ہے رہنے کو رہتا ہے اب بھی تو، مجھ میں
کوئی پرندہ ہے جیسے لہو لہو، مجھ میں

یہ ریگزار پنپنے مجھے کہاں دیتا
ابل پڑی وہ جو تھی قوتِ نمو، مجھ میں

ہو کوئی مسئلہ مجھ کو تو ایسا لگتا ہے
کہ دو حریف ہیں مصروفِ گفتگو، مجھ میں

ہوا بس اتنا کہ آنکھوں میں جم گئی آ کر
نہ رہ سکی مرے اندر کی ہاؤ ہو، مجھ میں

نہ آگ ہے نہ دھواں، ابر ہے نہ ریگِ رواں
بھٹک رہا ہے اک آسیبِ آرزو، مجھ میں

وہ تجربے ہیں کہ جی مصلحت پسند ہوا
رہی نہ اب وہ مروت جو تھی کبھو، مجھ میں

مجھے قبول ہیں یہ زخم بھی امیدوں کے
وہ دن نہ آئے کہ تو میرے نام پر چونکے

مزاج ہی نہیں بدلے، بدل گئے چہرے
اتار ڈالے ہوا نے نقاب کتنوں کے

بہت پکار رہا تھا پکارنے والا
بڑا ملال ہے ہم نیند سے نہیں چونکے

سمندروں کو بھی اب پی کے دیکھ لیتے ہیں
ہم اس قدر ہیں ستائے ہوئے سرابوں کے

۳۱ مئی ۱۹۷۱ء

میں اس کو پا نہ سکا، اس نے کھو دیا مجھ کو
کہاں یہ لا کے انا نے ڈبو دیا مجھ کو

میں اپنی تشنگیِ جاں کہاں کہاں لے جاؤں
اداس دشت ہے دریا بھی رو دیا مجھ کو

یہ قحطِ نور، یہ پاگل ہوا، اور ایسے میں
دکھا تا راہ کہاں تک کہو، دیا مجھ کو

میں پڑھ رہا ہوں ابھی تک کتابِ جسم تری
خدا نے حوصلۂ کفر تو دیا مجھ کو

ترا سمجھ کے تو یاروں نے دشمنی کر لی
وہ غم ہے ساتھ مرے تو نے جو دیا مجھ کو

نفس نفس تو بکھرنے کی شرط ٹھیری ہے
اس اہتمام سے کس نے پرو دیا مجھ کو

بنامِ شعر کہیں رازِ دل نہ کہہ جاؤں
کسی نے چپکے سے ناخن چبھو دیا مجھ کو

دراز قد نہیں میری طرح ہوں میں جس میں
یہ کس اجاڑ بدن میں سمو دیا مجھ کو

میں آنسوؤں میں نہا تا رہا ہوں جس کے لئے
اسی نے خیر لہو میں بھگو دیا مجھ کو

۱۳؍ جولائی ۱۹۶۸ء

قریب آ کے مجھے زخمِ آشنائی دیئے
اُن آدمیوں نے جو اجنبی دکھائی دیئے

جو میں نے زخم کا لے پارہ آئینہ لے کر
خود اپنے آپ کو ڈھونڈا تو تم دکھائی دیئے

غمِ حیات حقیقت کا نام ہے لیکن
غمِ حیات نے دھوکے بھی انتہائی دیئے

انا فریب ہے اور تشنگی ہے خودکشی
یہی خیال ستا تم کو بھی سجھائی دیئے

ہم اپنے قتل کا اب کس سے خوں بہا چاہیں
ہر آئینے میں تو قاتل ہمیں دکھائی دیئے

جو سوچا تھا تو دھندلے تھے منزلوں کے نشان
جو چل پڑا تو کئی راستے سجھائی دیئے

وہ شخص خلیؔ جو دامن بچا گیا اپنا
اسی نے اب ہمیں الزامِ نارسائی دیئے

۱۹/اگست ۱۹۷۱ء

آنکھوں پہ ابھی تہمتِ بینائی کہاں ہے
تو خود ہی تماشہ ہے تماشائی کہاں ہے

آئینہ ہوئی تشنگی پا یائی جاں سے
چہرے پہ تو لکھی ہوئی رسوائی کہاں ہے

اِن جاگتی آنکھوں کو ملے دھوپ کے بازار
اے دل وہ پگھلتی ہوئی تنہائی کہاں ہے

سورج ہے کہ بس نوک پہ سوئی کی کھڑا ہے
اب فرصتِ کم کم بھی مرے بھائی کہاں ہے

خوں چوستے لمحوں سے کہو ہاتھ پساریں
احساس کی صورت ابھی زردائی کہاں ہے

کچھ اور بکھر کر کہیں پہچان نہ کھو، لوں
اس شہر کو مٹی مری راس آئی کہاں ہے

وہ شخص بڑے چاؤ سے کچھ پوچھ رہا ہے
تو ایسے میں اے لذتِ گویائی کہاں ہے

خلیؔ اپنوں میں اک ہم ہی نکل آئے ہیں شاعر
شہزادگیٔ شوق پہ آیائی کہاں ہے

۲۵ر اکتوبر ۱۹۷۱ء

جانے کیا راز تھا کچھ اُس نے بھی پھیکا لکھا
ہائے کھلتا نہیں ہم پر بھی تو جی کا لکھا

ہم کہاں حرف شناس اتنے مگر پڑھتے ہیں
کاغذوں پر ترے ہاتھوں کی نمی کا لکھا

دل کو بازار سے ہو کر بھی گزرنا ہے تجھے
اپنے چہرے سے مٹا تیرہ شبی کا لکھا

ہم نے ویسے تو بہت خود کو بچانا چاہا
ایک اک حرف ہوا خودکشی کا لکھا

سایہ سایہ تجھے ترسے یہ الگ ہے لیکن
ہم نے سورج کو ترے ماتھے کا ٹیکا لکھا

وہ بسا شہرِ تمنّا کی زباں بھول گیا
خیر گزری کہ اُسے حال نہ جی کا لکھا

پاسِ جاں اتنا تھا یاروں سے بھی کم کم ہی ملے
اُن پہ کھلنے نہ دیا دستِ تہی کا لکھا

ہم وہ پتھر کہ لُٹے تیرے ہنر کے ہاتھوں
ہم ہیں بکھرے کہ تری بے ہنری کا لکھا

۱۶ر ڈسمبر ۱۹۷۴ء

یوں تو اکسایا بہت شوقِ نہایت نے اُسے
مجھ سے کھلنے نہ دیا پاسِ روایت نے اُسے

ہائے وہ شخص تو آئینہ لئے پھرتا ہے
کیسا لوٹا دلِ تنہا کی شکایت نے اُسے

دعویِ راہبری اور یہ ٹوٹے ہوئے پاؤں
یوں بھی گمراہ کیا راہِ ہدایت نے اُسے

اُس سے وابستہ ہے تحریرِ کتابِ جاں بھی
کھینچ لایا مری آنکھوں میں ہر آیت نے اُسے

جی یہی سوچ کے خوش اپنے خرابے سے نہ تھا
دکھ دیا میرے بکھرنے کی حکایت نے اُسے

وہ مرے جذبۂ پندار سے واقف ہی نہیں
خیلی مغرور کیا میری عنایت نے اُسے

۱۹۷۳ء

مقتل سجے ہیں کوچہ و بازار کی طرح
ہر شہر میں فساد ہے تہوار کی طرح

پوجے نہ جاؤ گے کسی اوتار کی طرح
بہتر یہی ہے جی لو گنہگار کی طرح

ہے بادِ تند سر کو پٹک کر لہولہان
جانِ حزیں ہے راہ میں دیوار کی طرح

یہ سوچتا کھڑا ہوں سرِ راہِ پیش و پس
کیسے نبھا ہوں تم سے ریاکار کی طرح

چہرہ بدل بدل کے جو آتا ہے سامنے
ہر شخص جی رہا ہے اداکار کی طرح

میں ہوں ازل سے راہروِ راہ منحنی
رستے میں پل صراط ہے دیوار کی طرح

۱۹۷۰ء

رکھا ہی وہاں اپنے لئے کیا ہے جو گھر جائیں
آؤ تو ذرا تشنگیٔ جاں سے گزر جائیں

اب تک تو ہیں بیگانۂ ہر راہگزر ہم
اٹھیں گے ترے در سے تو سوچینگے کدھر جائیں

راہوں میں تو روکیں گے سراؤں کے نگہباں
اب اتنے بھی پاگل تو نہیں ہم کہ ٹھہر جائیں

یہ راز بھی پندار ہے ثابت قدمی کا
کچھ کھوکھلے اتنے ہیں کہ چھو لو تو بکھر جائیں

۲۶ر جون ۱۹۷۰ء

وہ وحشی ہم ہیں کہ یوں بھی کسی کے بس کے نہیں
شروع ہی سے جو عادی کسی قفس کے نہیں

حرارتوں کا بھی اندازہ کر، جھلس کے نہیں
کہ زندگی کے تقاضے کوئی ہوس کے نہیں

سہا ہے کیا کیا نہ اب تک بھی ہم نے ہنس کے نہیں
تمہیں کہو کہ یہ حالات کس برس کے نہیں

اسی خیال سے پھر آنکھ لگ گئی شائید
ہمارا نام لبوں پر ابھی جرس کے نہیں

ہمیں نے کچھ نظر اندازیوں کی حد کر دی
بُرا نہ مان کہ یہ گھاؤ تیرے بس کے نہیں

حیاتِ جبر سے اے دوست موت بہتر ہے
گزار زندگی لیکن ترس ترس کے نہیں

نکل پڑے ہیں ہوائیں چراغِ جاں لے کر
ہم ابتدا ہی سے انسان پیش و پس کے نہیں

ہمیں سے کس لیے چنگاریاں الجھتی ہیں
ہم آدمی ہیں مگر خیر خار و خس کے نہیں

۲۳ مارچ ۱۹۷۰ء

سب تہی جام ہیں چپکے سے لبالب کر دے
کوئی احسان ہی کرنا ہے تو آب کر دے

بول حق بول رہا ہے تو کھلے لفظوں میں
اپنے لہجے کو نہ یوں حرفِ مذبذب کر دے

پیٹ بھر دینے کا وعدہ نہیں کافی یارب
پیٹ بھرنے کے وسیلوں کو مہذب کر دے

اُن نگاہوں کو جو ہیں مجرمِ کم کم نگہی
منظروں کا یہ تقاضہ ہے محدب کر دے

پھر مرے دور کا چہرہ بھی اُجاگر ہوگا
اک ذرا تو مرے زخموں کو مرتب کر دے

۱۳ر فبروری ۱۹۷۱ء

لئے لئے مجھے پھرتا ہے اب سفر ہی بہت
وہ دن بھی کیا تھے کہ تھی تیری رہگذر ہی بہت

چھٹیں وہ جھیل سی آنکھیں تو اور بڑھ گئی پیاس
بھٹک رہا ہے وہ پیاسا اِدھر اُدھر ہی بہت

چلو یہی سہی ہم خود ہی اپنے قاتل ہیں
بھلا لگے ہے یہ الزام اپنے سر ہی بہت

لگا اداس جو گھر تو نکل پڑا گھر سے
جو تھک گیا تو مجھے یاد آیا گھر ہی بہت

خدا کے واسطے تو جیت کر ملول نہ ہو
خوشی ہوئی یہاں یاروں کو ہار کر ہی بہت

کھلا یہ راز کہ وہ اتنا بدگماں بھی نہ تھا
ہمیں نے ظلم کئے اپنے آپ پر ہی بہت

بھڑک اٹھے بَن ہر سو ذرا ہوا تو چلے
ہے اپنی راکھ میں سویا ہوا شرر ہی بہت

وہ شخص جیسے مرا ہم نفس تو کیا ہوگا
ہے اس کے جی میں ابھی جسم و جاں کا ڈر ہی بہت

۲۲ر مئی ۱۹۷۰ء

تجھ کو پا لینے سے بہتر ہے ترا کھو جانا
آج اتنا مرا مایوسِ وفا ہو جانا

جب کوئی زخم ہتھیلی پہ لگا تو جانا
ہائے کیا چیز ہے پابندِ حنا ہو جانا

آج تک بھی وہی دیوانہ ادا باقی ہے
گھر سے نکلے تو تری راہگذر کو جانا

خشک لمحوں کے ہیں مارے ہوئے ہم لوگ ہمیں
رات بھیگے تو ضروری تو نہیں سو جانا

تو پشیمان نہ ہو، ہم نے یہی سوچا ہے
داغ ناکردہ گناہی کے ہیں، آ کے دھو جانا

پی لیا جب سے ترے درد کا امرت اے دوست
میں نے ہر سنگِ گراں کو ترا زانو جانا [1]

کون بھیڑ بھاڑ میں کیا جانے کہاں رہ جائے
آؤ فرصت ہے ابھی خاک اُڑا لو جانا

آج سونی ہیں بہت دیر و حرم کی راہیں
اس طرف ہو کے ذرا بادہ گسارو جانا

خیر آنکھوں کے تہی کاسے لئے پھرتا ہے
اور کس چیز کو کہتے ہیں لہو رو جانا

[1] یہ قافیہ میں نے غالب کی پیروی میں استعمال کیا ہے۔

۱۸ر جنوری ۱۹۷۱ء

جو شہرِ دل کو صحرا کر گیا ہے
وہی اک حرف اب تک گونجتا ہے

اسیرِ درد اک تم ہی نہیں ہو
ہمارے ساتھ بھی دھوکا ہوا ہے

بہت اونچی سہی دیوار گھر کی
گھروں کا حال چہروں پر لکھا ہے

ترستا ہے بہت سا غذ لہو کو
غمِ جاناں تجھے کیا ہو گیا ہے

اندھیروں میں بھنور سے پڑ رہے ہیں
کوئی رہ رہ کے ہنستا جا رہا ہے

میں یوں تو خیر آئینہ صفت ہوں
مجھے اسکا چہرہ اتنا بھا گیا ہے

اکتوبر ۱۹۷۱ء

سنا کہ تو، تو گھٹا تھی، برس برس بھی گئی
یہاں نگاہ تجھے دیکھنے ترس بھی گئی

چلو کہ خود ہی کسی راہ پر نکل جائیں
کہ اب امیدِ صدائے لبِ جرس بھی گئی

تو ایک خواب وہی میں بھی دیدۂ بے خواب
کہ تجھکو پانے کی ہر آس اس برس بھی گئی

وہ موجِ لمسِ بدن ہم کو چھو کے کیا گزری
جو اپنے آپ پہ اب تک تھی دسترس بھی گئی

۱۹۷۵ء

نہ چاہِ خشک کے ٹھیرے نہ شاخِ تر کے رہے
ہم اپنے گھر سے اٹھے کیا کہ دربدر کے رہے

ہماری راہ میں کیا کیا نہ پُلِ صراط آئے
ہمارے ساتھ مگر تجربے سفر کے رہے

ہماری فکر بھی اک دائرے میں قید رہی
چراغ بھی جو ہوئے ہم تو اک بھنور کے رہے

ہم اپنے آئینہ پیراہنی سے کب چھوٹے
ہزار سنگ زنی میں بکھر بکھر کے رہے

سفر دراز ہے اور شام ہونیوالی ہے
ہم انتظار میں کس خاکِ خوش خبر کے رہے

گزر گئی ہے نہایت سبک روی سے صبا
ہزار دامِ ہوس چشمِ معتبر کے رہے

وہ لوگ تھے جو کہانی کے مرکزی کردار
وہ حرف جیئے خواب بھر کے رہے

شکستگی تھی مقدر بدن تھے شیشے کے
ذرا سی ٹھیس بہانہ ہوئی بکھر کے رہے

لہو کی لہر اٹھی تھی کہ سر سے گزرے گی
چڑھے تھے کیا کیا سمندر مگر اُتر کے رہے

رؤف خیر سے آؤ کوئی غزل ہی سنیں
یہ مسئلے تو مرے یار عمر بھر کے رہے

۲۲ر فبروری ۱۹۷۱ء

اس خرابے میں جو لے گا نہ بھی کوئی مل جائے
مجھ سے پیاسے کو کڑے دشت میں پانی مل جائے

لاکھ قاتل ہی کیا کیجئے سب اپنے ہیں
کس کو پھانسی پہ چڑھائیں جو گواہی مل جائے

اپنی تنہائی سے مانوس بھی رہئے کچھ کچھ
کیا ضروری ہے کہ ہر موڑ پہ ساتھی مل جائے

میں وہ جنگل کہ سلگنے کی ہوس ہے مجھ میں
تیرے ہاتھوں کوئی چنگاری ذرا سی مل جائے

اک تعلق ہے مگر غیر شعوری ہے ابھی
اب تو یارب اُسے کم کم نگہی ہی مل جائے

خستہ بے چہرگی چھپ جائے یہی کافی ہے
کون کہتا ہے کہ زرکار قبا بھی مل جائے

۵۰

۹ مارچ ۱۹۶۹ء

ساگر کی تہوں میں کوئی جلتی ہوئی رو ہے
اب یوں مری رگ رگ میں ترے لمس کی لو ہے

سورج کا ترے سامنے کل قتل ہوا تھا
اک اور جنم دیکھ، وہ پھٹتی ہوئی پو ہے

ہر بار بدل دیتے ہیں لوگ اپنی نقابیں
بے چہرگیِ زیست کی کیا کیا تگ و دو ہے

کیا روک سکیں گی اسے شیشے کی فصیلیں
یہ سوچ تو غاروں کو اجالی ہوئی ضو ہے

بے گونج نہ ہوگی نغمہ درد کی آواز
حساس دریچوں سے گزرتی ہوئی ضو ہے

اک اپنے علاوہ نظر آتے ہیں سبھی خلیے
بے زاویہ نظریں ہیں کہ آئینہ نو ہے

۱۶ مارچ ۱۹۶۹ء

نہ جانے چیخ بنے درد یا دُعا ہو جائے
پتہ نہیں ترے جانے کے بعد کیا ہو جائے

کھنڈر کھنڈر ہی رہے اب نہ راستہ ہو جائے
دلِ غریب نہ پھر نذرِ حادثہ ہو جائے

ادھورے پن کا ہے احساس اپنے فن میں اُسے
وگرنہ آدمی اپنی جگہ خدا ہو جائے

دکھائی دینے لگے صاف پھر ترا چہرہ
ہر ایک زخم اگر دل کا آئینہ ہو جائے

وہ آدمی جو غمِ زندگی کا باغی ہے
اُسے شعورِ غمِ زندگی عطا ہو جائے

بجا سہی کہ حقیقت میں اک فریب ہے تو،
وہ کیا کرے کہ جسے اعتبار سا ہو جائے

امید و بیم تو یوں بھی ہے خیریت صدف
چلو اس آخری در پر بھی اک صدا ہو جائے

۱۹ر مئی ۱۹۶۹ء

سکوں مجھے بھی نہیں ہے اُسے بھی کیا ہوگا
مری طرح نہیں وہ بھی نہ جاگتا ہوگا

وہ اس خیال سے شائید نہیں ملا ہوگا
مرے لبوں پہ بھی جیسے کوئی گلہ ہوگا

میں اپنا قتل چھپا لوں تو اس سے کیا ہوگا
وہ پھر کسی کو یہاں قتل کر رہا ہوگا

اب اپنا شہر بھی اپنے لئے نیا ہوگا
کہ اتنے عرصے میں کیا کیا نہ ہو گیا ہوگا

دیارِ حسن میں بے چہرہ آہٹوں کے سوا
برائے دیدۂ بے خواب کیا بچا ہوگا

جھجک رہا ہے وہ آنکھوں کو ڈھانپ لو اپنی
نظر بچا کے گزر جانا چاہتا ہوگا

لگی ہے آگ ابھی اندرونِ خانہ ہی
ہوا چلے گی تو اللہ جانے کیا ہوگا

اسی دیارِ دکن کا کوئی فخر بھی ہے
یہ نام آپ نے شائید کہیں سنا ہوگا

۲۱ر اکتوبر ۱۹۷۰ء

نہیں کہ حسرتِ قاتل نکالتے رہئیے
رگوں میں خون اگر ہے اچھلتے رہئیے

زمانے لد گئے ماحول ڈھال لینے کے
اب اپنے آپ کو سانچوں میں ڈھالتے رہئیے

دیارِ کم نظراں راس آ نہیں سکتا
ہزار قرب کے پہلو نکالتے رہئیے

مِرا اصول مسلسل فریب کھانا نہیں
ہزار دام سرِ راہ ڈالتے رہئیے

اسی خیال سے میں دور ہو گیا اس سے
اب آستیں میں کہاں سانپ پالتے رہئیے

لگا ہی کیا ہے ابھی ہاتھ سیپیوں کے سوا
رؤف خیرؔ سمندر کھنگالتے رہئیے

یکم مئی ۱۹۶۸ء

اس ادا پر تو مٹا جاتا ہے طالب کوئی
سننے والا ہے کوئی اور مخاطب کوئی

آج تک بھی ہے جو تسکینِ انا سے قاصر
زندگی ہے کہ بھٹکتا ہوا راہب کوئی

مرنے والوں پہ تو بہتان تراشو لیکن
جینے والوں کو دو الزام مناسب کوئی

یوں تجھے دیکھ رہا ہوں میں تھکی نظروں سے
جیسے حالات سے شرمندہ ہو تائب کوئی

زندگی تو نے پلٹ کر نہیں دیکھا ورنہ
دور تک دیکھ رہا تھا تری جانب کوئی

غم جدا، فکر جدا، زیست کی اقدار جدا
خلیؔق شاعر ہے مگر میرؔ نہ غالبؔ کوئی

۶ر اکتوبر ۱۹۷۳ء

وہ قافلہ جو گیا کچھ وہ بے غبار بھی تھا
بچھڑ گیا ہوں کہ کچھ نیند کا خمار بھی تھا

بساطِ آئینۂ جاں پہ یہ غبار بھی تھا
شریکِ قوسِ بدن رنگِ ناگوار بھی تھا

اسی سے آس تھی جو ہے گواہِ برگشتہ[1]
میں بے گناہ تو انصاف کا شکار بھی تھا

انانیت کا جزیرہ تھا کم سوادی میں
جو بے ثبات ہوا، بحرِ بے کنار بھی تھا

یہ کیسا سایہ ہے، سائے میں جسم جلتا ہے
خدا گواہ مجھے دھوپ میں قرار بھی تھا

یہ تیرا پیار بھرا خطہ یہ گھر کا سنّاٹا
غلط نہیں ہمیں اک دوسرے سے پیار بھی تھا

[1] Hostile Witness

وہ آگیا ہے تو اب یہ سوال ٹھیرا ہے
اُسے خبر نہ ہو گھر کا جو حال ٹھیرا ہے

وہ روک لیتا تو رکتے کہ دھوپ تیز بھی تھی
سفر میں جان بچانا محال ٹھیرا ہے

ہمارا کیا ہے گزار دینگے جس طرح گزرے
ہماری راہ میں تیرا سوال ٹھیرا ہے

وہ چاہتا ہے کہ میں بھی بکھر بکھر جاؤں
مری نگاہ میں جس کا زوال ٹھیرا ہے

۲۶ مئی ۱۹۷۳ء

میں سمندر کسی کوزے میں سمٹتا کب ہوں
میں اگر پیاس بجھاؤں بھی تو گھٹتا کب ہوں

اے وہ خوش فہمی سے دامن کو جھٹکنے والے
والہانہ ترے دامن سے لپٹتا کب ہوں

کوئی مفہوم تلاشوں تری بے حرفی کا
تو جو اک صفحۂ خالی ہے، الٹتا کب ہوں

حوصلہ دیکھ کہ تنہا ہوں، مگر چلتا ہوں
میں بھٹکتا ہوں مگر راہ سے ہٹتا کب ہوں

دائرہ بنتا ہوا نقطۂ آغاز ہوں میں
خیمے پھیلی ہوئی آنکھوں میں سمٹتا کب ہوں

۱۷ر مئی ۱۹۷۶ء

ہم دور جانے سے رہے، پاس آنے سے رہی
یہ خاکِ شہر ہمکو تو راس آنے سے رہی

آنگن کے پانیوں میں یہ کاغذ کی کشتیاں
خوش تھیں کہ راہِ موجِ ہراس آنے سے رہی

میں زندگی کا ایک دہکتا الاؤ ہوں
گڑیا وہ موم کی مرے پاس آنے سے رہی

پھولوں کی بیلیں ہیں کہ نقابیں بھرم کی ہیں
بیرونِ بام و در ابھی گھاس آنے سے رہی

اے بے وفا حیات تجھے جانتے ہیں ہم
تیرے لئے دلوں میں ہراس آنے سے رہی

پیتے ہیں ایک عمر سے زہرابِ زندگی
لہجے میں اپنے بھائی مٹھاس آنے سے رہی

آنگن پہ حکمراں ہے جو خوشبو ہے اور ہی
ہر فرشِ گل سے ایسی تو باس آنے سے رہی

میں روشنی ہوں خیمہ مگر آگ بھی تو ہوں
یہ روح بے نیازِ لباس آنے سے رہی

غلط قدم کوئی ڈالا نہ جا سکا مجھ سے
ترے بدن کا اجالا نہ جا سکا مجھ سے

خزانۂ دل و جاں تیرے نام لکھ ڈالا
ترا خیال نکالا نہ جا سکا مجھ سے

میں وہ صدف ہوں کہ تہہ داریوں میں زندہ ہوں
تمہارا نام اُچھالا نہ جا سکا مجھ سے

مجھے وہ تیرے وسیلے سے جان سکتا تھا
مگر دیا جو حوالہ نہ جا سکا مجھ سے

مِرے لئے ہی تو سانچے بدل رہا تھا سمے
خود اپنے آپ کو ڈھالا نہ جا سکا مجھ سے

میں آگ لینے چلا تھا ریاضِ فن کی طرف
وہ نور تھا کہ سنبھالا نہ جا سکا مجھ سے

لکھا ہوا تھا کوئی نام ریگِ ساحل پر
جو موج سنبھالا نہ جا سکا مجھ سے

یقین کر کہ عجب بوجھ ہے بدن کا بوجھ
ترے بغیر سنبھالا نہ جا سکا مجھ سے

بہت بلند ہے مجھ میں جو خلش رہتا ہے
کہ سر کیا وہ ہمالہ نہ جا سکا مجھ سے

۲۹ر جولائی ۱۹۷۶ء

یہ اہتمام جو ہر رہگذر میں اتنا ہے
ہمارا پیار دلِ بحر و بر میں اتنا ہے

بہت دنوں سے ہمیں گھر کی یاد آ نہ سکی
جو دھوپ ہے کبھی تو سایہ سفر میں اتنا ہے

یہ آسمان تو کچھ بھی نہیں ہے میرے لئے
لہو کا زور مرے بال و پر میں اتنا ہے

قلم اٹھائیں تو آنکھوں کا اعتبار اٹھے
ہماری چشمِ تماشہ نگر میں اتنا ہے

یہ اور بات کہ ٹھیرا ہے سکۂ باطل
روایتوں کا خزانہ کھنڈر میں اتنا ہے

یہ برگ و گل ہیں کہ نامے ہوا کے ہاتھوں میں
نہ پڑھ سکوں گا کہ لکھا شجر میں اتنا ہے

میں اپنی ذات سے اس کے لئے ہوا بن جاؤں
نمو کا جوش اگر کچھ شرر میں اتنا ہے

چُنا ہوا کوئی دستر بچھا ہوا بستر
ہمارے واسطے بس اپنے گھر میں اتنا ہے

رؤف خیر نے کچھ دیر خاک اُڑا ای ہے
کہ اختیار زمینِ ظفر[1] میں اتنا ہے

[1] ظفر اقبال

ہم نے ہر چند کہ سورج کی قسم کھائی بہت
رات گزری نہیں آنکھوں میں اتر آئی بہت

ہم ہیں جیسے کسی گرداب میں پھینکا ہوا پھول
لے اڑو مٹتی ہوئی لوئے شناسائی بہت

ہم کو یہ ضد کہ وہیں پاؤں جمائیں اپنے
اس جگہ کائی بہت اور تماشائی بہت

بات چھوٹی سی سہی، زخم بھی پایاب سہی
کیا کروں ہے مرے احساس میں گہرائی بہت

کیا کیا ہنگامے سنا، اپنے نہ ہونے سے ہوئے
ہم نہیں تھے تو وہاں لوگوں کی بن آئی بہت

ہم نےکو کار نہ تھے یوں بھی یہ منصب کیا ہے
شہرتِ شعر میں شامل تو ہے رسوائی بہت

تجھ کو کیا کھویا کہ پہچان بھی کھو دی اپنی
خیر دھند لا گئی آئینے کی بینائی بہت

۱۵؍جولائی ۱۹۷۶ء

کچھ ہیں اوصاف ہواؤں میں بھی شائد میرے
ریگزاروں کے مقابل ہیں عقائد میرے

ایک دریا سہی میں کوئی سمندر نہ سہی
تم پہ کھل جائیں گے اک روز فوائد میرے

تو وہی میرے لئے آج بھی میں تیرے لئے
فاصلے تجھ سے کوئی کم ہوں کہ زائد میرے

ہے لبِ دیدہ پہ وہ ذائقۂ ریگ رواں
کس سمندر کے ہیں محتاج قصائد میرے

خون کے پیاسے نہیں راہ کے طالب ہونگے
اب مری کھوج میں پھرتے ہیں جو قائد میرے

خیر انسان ہوں اوتار نہیں ہوں کوئی
یہ معائب تو ہیں بس حشو و زوائد میرے

۲۹ر جولائی ۱۹۷۶ء

چشمِ بینا تھا لئے ہاتھ میں عدسے کب تھا
مجھ جنوں پیشہ کا یارانہ خرد سے کب تھا

بچ گیا ہے مرے پیراہنِ خوش کے صدقے
ورنہ وہ شخص تو باہر مری زد سے کب تھا

کھل گیا ہم کو ترا خود کو قدآور کہنا
ورنہ انکار ہمیں بھی ترے قد سے کب تھا

تو جو آکاش ہی ٹھیرا تو سمندر میں ہوں
نیلگوں جسم مرا زہرِ حسد سے کب تھا

جو عقیدہ نہ بنا وہ نظریہ ہوں میں
اس پرندے کو علاقہ کسی حد سے کب تھا

ہم لئے پھرتے ہیں پہچان ہنرمندی کی
شہر میں نام ہمارا اب و جد سے کب تھا

خیر اک یہ بھی مرے قدر شناسوں میں سہی
میں جو منظر ہوں، مفر دیدۂ بد سے کب تھا

۱۵ جولائی ۱۹۷۶ء

مسلکِ شعر میں ہرچند نبوت بھی ملے
میں نبی ہوں تو خدا یا مجھے امت بھی ملے

جو تمہیں سونپ گیا تھا وہ مسرت بھی ملے
لوٹ آیا ہوں تو اب میری امانت بھی ملے

میں سوا نیزے پہ آیا ہوا سورج ہوں، مجھے
شہر میں دھوم ہے جس کی وہ قیامت بھی ملے

ایک مدت میں ملا ہے تو مرا حال نہ پوچھ
کیا ضروری ہے کہ ہر چیز سلامت بھی ملے

اشتہارات ہیں یہ لوگ غلط بخشی کے
انکو دولت ہی ملی ہے تو رعونت بھی ملے

وہ سمجھتا ہے مجھے روح کا ادراک نہیں
میری خواہش کہ اسے جسم کی لذت بھی ملے

تحتِ حیرہ میں یہی خواب لئے پھرتا ہوں
میرے آئینے کو شاید تری صورت بھی ملے

میں تبرک ہی کا قائل نہ تعیش کا نقیب
چیز کوئی ہو ذرا حسبِ ضرورت بھی ملے

خلیؔ ہم اس کو برا بھی تو نہیں کہتے ہیں
وہ بھلا ہی سہی پر اپنی طبیعت بھی ملے

۱۳ر جون ۱۹۷۶ء

کیوں نگاہِ غلط انداز بھی سہہ لی جائے
اس سے بہتر ہے کہ اب گھر کی ہی رہ لی جائے

زندگی ہے کہ قیامت کی گھڑی ٹھہری ہے
سبھی بے سایہ ہیں اب کس کی پنہ لی جائے

تو بساط اپنی الٹ مت ہمیں لطف آتا ہے
ہر قدم تجھ سے وہی مات کی شہ لی جائے

تم جو منظر ہو تو پھر آنکھ سے اوجھل نہ رہو
تم کو لازم ہے کہ بس دادِ نگہ لی جائے

اپنے جینے کی خوشی بھی نہیں یاروں کو یہاں
کس سے اب تہنیتِ سالگرہ لی جائے

لوگ کیا کیا تری محفل سے اٹھے جاتے ہیں
خوف آتا ہے کہ کس کس کی جگہ لی جائے

بے لباسی کا بھرم بھی ہمیں رکھ لینا ہے
بام و در سے تو ذرا شام روپہلی جائے

میں خطا کار، گنہ گار، سیہ کار نہیں
ہاں شہادت میں جو وہ چشم سیہ لی جائے

ان ٹکوں میں تو وہ جنت بھی رہی ملنے سے
نیکیاں دے کے کوئی فردِ گنہ لی جائے

حیدرآباد کی آئے نہ کوئی بات کہیں
بمبئی جائے بھلے ہی کوئی دہلی جائے

محفلِ شعر میں جانے سے تو بہتر ہے یہی
اک غزل خیر کہیں بیٹھ کے کہہ لی جائے

۱۳ر اگست ۱۹۷۶ء

سحر ٹوٹا ہے سمندر کی گراں خوابی کا
ہر قدم مجھکو گلہ ہے وہی پایابی کا

زرد صحرا سے الرجی ہے سوادِ جاں کو
سورۂ سبز مداوا مری بے تابی کا

میری ٹھوکر سے تو ہر دشت میں زمزم پھوٹے
سلسلہ رک نہیں سکتا مری شادابی کا

ہم ہنرمند بہت، راہ بناتے گزرے
اُس سمندر کو بڑا ناز تھا گردابی کا

میں کہاں اپنے خد و خال سے ناواقف ہوں
سامنا ہے مجھے آئینۂ کم آبی کا

ہم تو ہر خطۂ نایافت کے کولمبس ہیں
ہم پہ الزام نہ رکھنا کسی نایابی کا

خیر سورج نہ سہی، شمع سرِ راہ تو ہو
یہ دھواں ہونا ہے کیا مشعلِ محرابی کا

پتّے تمام حلقۂ صرصر میں رہ گئے
ہم شاخِ سبز میں شجرِ تر میں رہ گئے

گھِر کر جو ہم سپاہِ سکندر میں رہ گئے
ہاتھی ہمارے اپنے ہی لشکر میں رہ گئے

لکھ لینا اسقدر وہ سفینے نہیں مرے
ساحل پہ رہ گئے جو سمندر میں رہ گئے

آثارِ ایک خرابۂ آباد ہو کے ہم
سینوں میں رہ نہ پائے تو پتھر میں رہ گئے

اس لذتِ سفر کو میں اب اُن سے کیا کہوں
جو سایہ ہائے سرو و صنوبر میں رہ گئے

باہر ہی چھوڑ آئے وہ چہرہ جو خاص تھا
اک عام آدمی کی طرح گھر میں رہ گئے

تم تو انا کا ایک جزیرہ ہو، سوچ لو
ایسے کئی جزیرے سمندر میں رہ گئے

رسوا انھیں بدن کے تقاضوں نے کر دیا
کیا لوگ تھے جو ٹوٹ کے پل بھر میں رہ گئے

۲۵ر فروری ۱۹۷۷ء

آگ یا آگ کا گماں سا ہے
جس طرف دیکھئے دھواں سا ہے

ہائے ہر موڑ بے اماں سا ہے
تیرا ملنا بھی رائگاں سا ہے

بے زمینی سی بے زمینی ہے
یہ علاقہ مرے مکاں سا ہے

رات، سناٹا، دھند، بے رستی
اور رگ رگ میں تو رواں سا ہے

میں زمیں ہوں مگر مرے اندر
کوئی تو ہے جو آسماں سا ہے

تجھ سے کھل کر نہ کہہ سکے سچ ہم
ایک پردہ جو درمیاں سا ہے

ہم بھی بھلگے ہوئے بیمبر ہیں
ہمکو بھی مچھلیوں نے پہچانا ہے

کیا بھنور، کیا ہوا، سمندر کیا
پردۂ جاں کہ بادباں سا ہے

خیر بینائی گیا ملی ہم کو
ہر تماشہ دھواں دھواں سا ہے

۸ر مارچ ۱۹۷۷ء

نچوڑ خوش نظری کا ہے رس جو مجھ میں ہے
کہ مکھیوں سے الگ ہے، مگس جو مجھ میں ہے

تمہاری ذات سے ہٹ کر بھی ایک دنیا ہے
مگر یقین تو کرے وہ قفس جو مجھ میں ہے

تو اپنی ذات سے آہن، نہ میں کوئی پارس
جلا رہا تو ہے تجھکو وہ مس جو مجھ میں ہے

میں اپنے ہمسفروں سے بچھڑ نہ پاؤں گا
جگائے رکھتا ہے سحرِ جرس جو مجھ میں ہے

ترا ذرا سا بڑھاوا ملے تو طے ہو جائے
تمام مرحلۂ پیش و پس جو مجھ میں ہے

عجب مکان ہوں، بکتا ہی ہوں نہ بستا ہوں
کھنڈر بنا کے نہ رکھ دے ہوس، جو مجھ میں ہے

شکست و ریخت ہر فلسفہ ہے، یا میں ہوں
کہ ٹوٹ جائیگا پھر اس برس، جو مجھ میں ہے

۱۶ر مارچ ۱۹۷۷ء

اُن سے کہنا، جو سکندر ہو گئے ہیں
ہم بھی اب بازو برابر ہو گئے ہیں

ہم کو ئی خوش ہیں جو بے گھر ہو گئے ہیں
مسئلے کچھ تم سے بڑھ کر ہو گئے ہیں

آسماں اپنی جگہ تھا بے رعایت
ہم پرندے خود ہی شہپر ہو گئے ہیں

کیسی تصویروں کا پس منظر کھلا ہے
کیسے آئینے مکدّر ہو گئے ہیں

بے گناہوں کو سزا دینی پڑی ہے
ہم بھی کن ہاتھوں کے پتھر ہو گئے ہیں

یہ گھریلو، ناپسندیدہ مسائل
سرخیِ اخبار کیونکر ہو گئے ہیں

جتنے جادوگر ہیں ٹھیرے کیمیاگر
کیسے پیمانے مقرر ہو گئے ہیں

۱۵ مئی ۱۹۷۶ء

سب رشتہ ہائے حرف و اشارات کھو گئے
ہم کھو گئے کہ تیرے نشانات کھو گئے

ہم لوگ جیسے قوسِ قزح کے پجاری تھے
اے اعتبارِ رنگ ترے ساتھ کھو گئے

سر سے گزر رہی ہے ہر اک موج کم سواد
ہم سوچتے ہوئے تو یہی بات کھو گئے

یہ کیسا انتقام ہے اور کس کے ساتھ ہے
آنکھیں عطا ہوئی ہیں مگر ہاتھ کھو گئے

یہ بے کناریاں ہیں کہ سب کم سوادیاں
سورج کو پا لیا تھا کہ ذرات کھو گئے

نکلے ہم اس سے ملنے کی خاطر مکان سے
صدیاں نہیں وہ راہ میں لمحات کھو گئے

الفاظ جوڑنے کا ہنر عام ہو گیا
ہے سانحہ یہ خیر کہ نغمات کھو گئے

نظمیں

یکم دسمبر ۱۹۷۳ء

"بے اثاثہ"
(والد مرحوم کی نذر)

یہ واقعہ ہے کہ میں ابن بے اثاثہ ہوں
نہ کوئی گھر نہ زمیں پائی میں نے ترکے میں
وہ ایک گھر جو تھا پرکھوں کا آخری پندار
ہوا ہے اس پہ بھی اتمامِ لطف آخرِ کار

مری شریکِ نفس ہے تمہاری ہانپتی سانس
مرے بدن میں تمہارا پسینہ شامل ہے
تمہارا رعشہ گناہوں سے روکتا ہے مجھے

یہ ہاتھ خالی نہیں، صاحبِ قلم ہوں میں
یہ آنکھ کاسہ نہیں، چشمِ معتبر ہوں میں
یہ دل سیاہ نہیں، نور کا سمندر ہے

مجھے تمہارے وسیلے سے مل گیا کیا کیا
یہ جھوٹ لگتا ہے، میں ابنِ بے اثاثہ ہوں

۲۰ر دسمبر ۱۹۷۳ء

یارانِ بے وسیلہ

یہ غار، غارِ حرا نہیں ہے
چلے تھے پکنک منانے لے کر شراب کی بوتلیں
اچانک
چٹان نے ڈھک لیا ہے رستہ
کوئی بھی راہِ مفر نہیں ہے

اَ تو زانی ہے،
بَ نے مزدوریاں ہڑپ کی ہیں
جَ قاتل ہے اپنے والد کا

کسی کے فردِ عمل میں ایسا نہیں ہے کچھ بھی
جسے وسیلہ کریں دعائے نجات مانگیں

کیسے وسیلہ بنا کے راہِ نجات ڈھونڈیں؟

۱۹ مئی ۱۹۷۶ء

احیاء

تو خرابوں سے گزرتے ہوئے پیغمبر نے
اُن خرابوں کے مکینوں کا جب احیاء چاہا
خوابِ مرگ آسا ملا
آنکھ کھولی تو یہ دیکھا
خرِ خوابیدہ تھا ریزہ ریزہ
گرم و تازہ تھا مگر زادِ سفر
اور پھر شہر میں سکوں کا چلن بھی بدلا

میں پیمبر نہ سہی،
دیدۂ بے خواب کے ساتھ
رات دن ایسے خرابوں سے گزرتا ہوں
جہاں مکڑیاں عیش کیا کرتی ہیں
بھوکے بچوں کو جہاں ممتائیں
دودھ کیا دیتیں فقط کوس لیا کرتی ہیں
شہر میں عام ہیں کھوٹے سکے

میں پیمبر نہ سہی، تو، تو خدا ہے اب بھی
اِن خرابوں کے مکینوں کا بھی احیاء ہو جائے

۱۲ر ستمبر ۱۹۷۰ء

بونوں کا خواب

ساحلی علاقوں پر رہنے والے بونوں نے
ریت کے گھروندوں سے سر نکال کر دیکھا
لمبے چوڑے شہروں کے اونچے اونچے محلوں میں
خوش ادا و قدآور بعض لوگ رہتے ہیں
سارے لوگ عزت سے جن کا نام لیتے ہیں

ساحلی علاقوں پر رہنے والے بونوں کے چہرے تمتما اٹھے
جیسے ان کے سینوں میں کوئی پھانس چبھتی ہو

ایک روز بونوں نے جمع اک جگہ ہو کر
فیصلہ یہ فرمایا
ایک ایک قدآور قتل کر دیا جائے

خوش ادا و قدآور قتل ہو گئے لیکن
مسکراتے بونوں کا قد تو پھر بھی چھوٹا ہے

۱۵ر ستمبر ۱۹۷۱ء

دائرے

حیات دائروں میں منقسم
ہزار گردشوں پہ مشتمل
ادھورے خواب جہد کی علامتِ شکستہ
ٹوٹتی بکھرتی قدریں
جسم و جاں کی بے سکونیاں
خرد سے معرکہ
جنوں سے صلح
آرزو کے فاصلوں کا نام ہے

حیات بہتا آئینہ
جو کوہسارِ جاں سے پھوٹ کر بہے تو
دشت دشت کی ہزار برس کی
خود کو دیکھنے کی تشنگی بجھائے
اعتبارِ چہرگی عطا کرے

شعور کرچیاں چبانے کا
فریب کھانے کا
گلے گلے لہو میں ڈوب جانے کا

ازل سے گھونگھے اپنے اپنے خول سے نبرد آزما
وہی مقابلہ "ہزار دست وچشم برجبیں" طرح کے آدمی سے
پھر وہی شکست و ریخت
دائروں میں منقسم

یہی ازل سے ہو رہا ہے

حاکمانِ شہر — پتھروں کے بُت
جو شاہراہِ عام پر ہیں نصب

ٹوٹیں بھی یہ بُت

تو کوئی اور بُت !

قطرۂ آب ایک پتے پر
اور ساگر میں ڈولتا پتہ
زلف کھولی ہوئی جواں لہریں
گود پھیلائی سیپیوں کا ہجوم

سیپیوں لہروں اور قطرے میں
فاصلہ صرف ایک پتے کا

پھٹ پڑا پھر شباب لہروں پر
بڑھ گئی سیپیوں کی بے چینی
اور کچھ راس آ گئی تھی ہوا
پھر اچانک الٹ گیا پتہ

اب وہ قطرہ نظر نہیں آتا
اب وہ موتی ہے یا سمندر ہے

۱۹۷۳ء

لذتِ آوارہ

میں اک بہتا ہوا دریا
مری فطرت میں ہے سیراب کرنا
وہ چاہے کوئی ہو آباد کرنا
مگر میں جس ڈگر سے بہہ رہا ہوں
وہاں سب ریت کے تودے کھڑے ہیں
نمو کی قوتوں سے بانجھ، جنکو نہیں معلوم
کس کو لذتِ تخلیق کہتے ہیں
یہ تودے صرف خالی سیپیوں کا بوجھ ڈھوتے ہیں
گہر تو مجھ میں ہوتے ہیں
یہ تودے ہیں ہوا کی ٹھوکروں میں
سرخ سورج کی نگاہِ قہر سے حیراں
کبھی میرے تموج سے پریشاں

اگر یہ ریت مجھ کو قید کرنے کی نہ سوچے
تو اس کو لذتِ تخلیق دے دوں

۲۳ر فروری ۱۹۶۸ء

پناہ

بے تحاشہ دوڑتا ہے
اک سراسیمہ ہرن
اڑ رہا ہے دور تک اسکی چھلانگوں سے غبار
اک شکاری اس کا پیچھا کر رہا ہے دیر سے

خوف کا مارا،
پریشان،
تھرتھراتا یہ ہرن
ایک بھوکے شیر کے مسکن میں لیتا ہے
پناہ

دو بونے

دو بونے آپس میں لڑ کر
چاہتے ہیں یہ ثابت کرنا
دونوں میں اک قد آور ہے
حالانکہ دونوں کے دونوں
ریتیلے ٹیلوں پہ کھڑے ہیں

ان سے لاکھ کہا — اے بھائی
دونوں کا قد اک جیسا ہے
لڑنا چھوڑو

لیکن بونے پھر بونے ہیں

۲۴ر مارچ ۱۹۷۷ء

چاند، بڑھیا اور کٹھ پتلی

(ایک سیاسی نظم)

اک بڑھیا جو چاند میں چرخہ لے کر بیٹھی
سپنے کات رہی تھی
پنبۂ جاں سے دھاگا دھاگا جوڑ رہی تھی
سوچ رہی تھی
ہر دھاگے سے اک کٹھ پتلی باندھ سکے گی
دھرتی ٹیڑھا آنگن ہو تو کیا لینا ہے
کٹھ پتلی بڑھیا کے ہاتھوں ناچ سکے گی

ہاتھ میں رعشہ،
کچا، بودا، گنجلک دھاگا
تانا بانا ٹوٹ چکا تھا

وہ چرخہ بے معنی ٹھیرا
چاند کی بڑھیا خواب ہوئی

تین مربوط نظمیں[۸۶]

۲۹ر نومبر ۱۹۷۲ء

ساعت خود تحفگی

اب تو میں اس ساعتِ خود تحفگی کا منتظر ہوں
فائیلوں کے بوجھ سے اٹھ کر جو گھر پہنچوں
تو اک معصوم کلکاری کے آئینے میں
اپنے آپ سے مل کر
مگن ہو لوں
تھکن بھولوں

۱۰ر جنوری ۱۹۷۴ء

ساعت خود تحفگی کا مرثیہ

وہ مسکان جس کا کہ میں منتظر
تتلیاں منتظر
دستِ جود و عطا سے
مرے کاسۂ جاں میں آئی
تو بے رنگ تھی

۲۰ر جنوری ۱۹۷۷ء

دودھ کا عذاب

کنواری ماں کے کنوارے سینے کو دودھیا نور دینے والے
اے پاک مریم کے پاک پروردگار احسان اتنا کر دے
جو چھوٹے چھوٹے لبوں کو محرومِ ذائقہ کر دیا ہے تو نے
تو اس کی ماں پر بھی رحم فرما
عذاب یہ دودھ کا اٹھا لے

۱۰ر جون ۱۹۷۱ء

قصہ دل دکھنے کا

یہ میں نے سوچا تھا (صبح دہلیز چھوڑتے وقت)
لمحہ لمحہ خلوص یاراں پہ وار دونگا
بجھے ہوؤں کو جو راکھ ہونے کے وہم میں مبتلا ہیں
دونگا لہو کا اندھن
اور ان کی فالج زدہ حسوں کو جھنجھوڑ دونگا
تھکے ہوؤں کو صدائیں اپنی میں لوچ بھر کر پکار لوں گا
جو سوچتے ہیں کہ زندگانی گزارنا ہے گزار لیں گے
انھیں بتاؤنگا ان کا حق زندگی پہ کتنا ہے

میں نے سوچا تھا
اب کسی کا نہ دل دکھاؤنگا
طنز پہ قہقہے ملیں گے تو ان کو ہنس ہنس کے ٹال دونگا

میں اب سرِ شام گھر کو لوٹا ہوں
اور مرا دل دکھا ہوا ہے

۲ر اکتوبر ۱۹۷۱ء

صدف ہدف

تو فقط جسم ہی جسم
ہونٹ ہی ہونٹ
پیاس ہی پیاس ـــــــ خون طلب

میں فقط روح ہی روح
آنکھ ہی آنکھ
پیار ہی پیار ـــــــ حسن طلب

اور ترا جسم وہ ٹکسال جہاں خوں کے عوض
آٹھوں پہر سکّے ڈھلا کرتے ہیں
جن پہ قابض کوئی بوڑھی ڈائن
تو فقط جسم ہی جسم

کیا قیامت ہے مری روح سے ٹپکے ہوئے سانچے موتی

تیری اقلیمِ بدن میں کھوٹے!

راکھ اور سیندور

کریدو راکھ نہ ماضی کے خواب زاروں کی
کہیں بجھیں نہ تمہاری ہتھیلیوں کے کنول
کہیں نہ مانگ پہ اڑ اڑ کے راکھ جم جائے
کہیں نہ مانگ کا سیندور ماند پڑ جائے۔

تمہاری آنکھ میں آنسو ارے یہ کیا پگلی
جو ہو چکا ہے شکایت ہی آج کیا اس کی
تمہارے پیار کی تقدیر ہو گیا سیندور
مرے خلوص کی قسمت میں راکھ ہونا تھا

چلو میں چھوڑ کے آؤں تمہارے گھر تم کو

نہیں نہیں ـــــ اب اکیلی ہی تم چلی جاؤ

۹۰

آزادیِ نفس

طلوعِ صبح سے پہلے اندھیری راتوں میں
نہ جانے بیٹھ کے یاروں نے کیا کیا سوچا تھا

وہ آفتاب جو تھا بے اسیروں کا نقیب
لہو کے طشت سے ابھرا تو سر پہ چمکا تھا

سیاہیوں کی اکھڑنے لگی تھی سانس بہت
ہر ایک شخص کے چہرے پہ نور اترا تھا

جلو میں خواب سہانے لئے ہوئے۔ وقفہ
ہزار جہدِ مسلسل کے بعد آیا تھا

سکونِ خواب کو آنکھیں ترس گئی تھیں بہت
کھلی جو آنکھ تو یاروں نے یہ بھی دیکھا تھا

ہر ایک شخص کی آنکھوں میں اجنبیت تھی
وہی ہوا کہ فقط اعتبار اپنا تھا

پڑی ہوئی تھیں دراڑیں کھنچے ہوئے تھے خطوط
خلوص، قرب، تعلق تو جیسے دھوکا تھا

وہ عہدِ کم نگہی لوٹ کر نہ پھر آئے
لہو کا نقش جسے لذتِ تماشہ تھا

مجھے یہ آرزو، تہذیبِ نو میں ایسا ہو
کوئی کٹھور تو کوئی خدا ترس بھی ملے
کہ پھول پھول پہ بھنورا نہیں مگس بھی ملے

وہ جو بلند نظر ہے، کبھی نہ ایسا ہو
اسیرِ پنجۂ احساسِ پیش و پس بھی ملے

کہاں تلک کوئی گن گن کے سانس لیتا رہے
کہ جسم و جاں کے لئے بادِ بے قفس بھی ملے

رہے نہ کوئی بھی پابندی دست و بازو پر
ہر ایک شخص کو آزادیِ نفس بھی ملے

گریباں گیر خرد ہے جنوں تو اتنا ہو
فقیہہ شہر کے دامن پہ دسترس بھی ملے

۲۲ مئی ۱۹۷۰ء

جمنا بہے نہ رات

چاندنی اوڑھ لی مناظر نے
چاندنی روندتا نہیں کوئی
دل کی دھڑکن کی نغمگی کے سوا
چیختا کوندتا نہیں کوئی

سوچتی خامشی کے ہونٹوں پر
ایک بیتی ہوئی کہانی ہے
خواب آلودہ چشم جمنا میں
ساری رودادِ ناگہانی ہے

سارا ماحول ایک چپ کا اسیر
اور سوچو تو بولتا بھی ہے
رس پرانی لطیف یادوں کا
ساغر جاں میں گھولتا بھی ہے

بند دروازے کھولتا بھی ہے

تاج کا حسن چودھویں کی یہ رات
چومتی لہروں کا حسین گناہ
زاویوں زاویوں سے دیکھتی ہے
اک بھنور بن کے رہ گئی ہے نگاہ

جاگتی روح سوچتی آنکھیں!
ابھی جمنا بہے نہ رات بہے
ابھی آنکھوں میں پیاس باقی ہے
یہ فضا اور دو گھڑی تو رہے

اف یہ جمنا کا شیشۂ سیال
تاج کے عکس کا یہ باؤلا رقص
یہ کہانی، یہ چاندنی یہ پیاس
کس طرح سہہ لوں میں اکیلا شخص

۲۵ر اکتوبر ۱۹۶۸ء

الٹ رہا تھا پرانی کتاب کے اوراق
کہ ایک صفحۂ رنگیں مجھے نظر آیا
بہت ہی غور سے میں دیکھتا رہا جسکو
بڑا حسین تخیل تھا اک مصور کا

میں محوِ حسن تھا اور انگلیاں بہ جستجو تھیں
خطوطِ جسم کہ طالب تھے گدگداہٹ کے
نظر کہ مانگ رہی تھی نشانہ ہائے نظر
لبوں کے جام بھی پیاسے لبوں کے طالب تھے

یہ شاہکار تو تھا لیکن اسکا اک پہلو
مرے مذاقِ نظر پر کسی قدر تھا گراں
مجھے لگا کہ ہے محتاج ایک آنچل کا
گلابی جسم کا مغرور سینۂ عریاں

مرا خیال صبا نے بھی جیسے بھانپ لیا
الٹ گیا اسی لمحے کتاب کا صفحہ

۲۵ر دسمبر ۱۹۷۵ء

نگاہِ آئینہ ساز میں

یہ فلسفہ جھوٹ ہو چکا ہے کہ جو سمے بھی گزر گیا ہے
بھلا وہ کب لوٹ آسکا ہے، یہ فلسفہ جھوٹ ہو چکا ہے
یہ زندگی ایک دائرہ ہے
زمانہ یوں بھی تو خود کو دہراتا آرہا ہے
یہ خون جو اپنے باپ دادا سے ہمکو ورثے میں مل چکا ہے
اب اپنے بچوں کے جسم میں رقص کر رہا ہے
ہر ایک ذرہ ہزار صورت سے جلوہ گر ہے
ہر ایک عشر عشیر اپنی جگہ خدا ہے
شکستگی ہی جن آئینوں کا ہوا مقدّر
اُن آئینوں میں تو اور بھی حسن آگیا ہے
اُن آئینوں میں کمالِ جلوہ گری سِوا ہے
کہیں کوئی فاصلہ نہیں ہے
شکستگی پہ تو زندگی فتح پا چکی ہے
شکستہ ویلے بساط اب کوئی شئے نہیں ہے
کہ حسنِ ردِ شکستگی سے حیاتِ نو پا رہی ہے ہر شئے

ہر ایک ٹوٹا ہوا تعلق
ہر ایک بکھرا ہوا تماشہ
ہر ایک منظر جو کھو چکا ہے
ہر ایک جذبہ جو راہ تک تک کے اک سر شام سو چکا ہے

وہ سارے لمحے
وہ سارے جذبے
وہ سارے رشتے پلٹ کے آتے ہیں

بس اتنا اب حوصلہ کرو تم
جو لوٹ آئیں تو اپنے سینے سے بھینچ لو تم

سائنس

۳۱ جنوری ۱۹۶۹ء

نذرِ غالبؔ

محرف ہو چکیں تورات کی سب آیتیں بھائی
نئے پیغمبروں پر اب نئے سورے اترتے ہیں
جو اپنے دور کے معیار پر پورے اترتے ہیں
نئے معنی دکھاتی ہے نئے لفظوں کی رعنائی

نئی دھوپوں میں پچھلی رات کے سب خواب زردائے
مسائل نور کی ہر بوند پی لینے کے عادی ہیں
اِدھر ہم بھی نئے سورج اُگا دینے کے عادی ہیں
کہ ہم ڈرتے ہیں اپنے قد سے بڑھ جائیں نہ یہ سائے

غلط ہے یہ کہ ہم ماضی کی تصویروں سے چڑتے ہیں
مگر یہ سچ ہے اپنا درد اپنا درد ہوتا ہے
ترے لہجے میں اپنا غم سمونا ایک دھوکا ہے
نئے لوح و قلم پیچیدہ تحریروں سے چڑتے ہیں

تو اپنے دور کی آواز تھا یہ مانتے ہیں ہم
مگر جو غم ہے اپنے دور کا پہچانتے ہیں ہم

۱۵ر فروری ۱۹۷۱ء

نذرِ ملٹن

بڑے مزے میں تھا تیئیس ۲۳ سال تک ملٹن
غمِ حیات سے جب اسکو ہمسری بھی نہ تھی
مزے کی بات تو یہ ہے خود آگہی بھی نہ تھی
ادا ادا سے نمایاں تھا اس کا بھولا پن

ہوئی نہ تھی ابھی حالات سے شناسائی
نہ گھر کی فکر نہ باہر سے خوف آتا تھا
بڑے سکون سے ہر روز بیت جاتا تھا
ملا نہ تھا ابھی اسکو شعورِ تنہائی

یہاں یہ حال کہ تیئس ۲۳ سال کا عرصہ
پلک جھپکتے تو کیا بیتتا کہ راہوں میں
ہزار موڑ تھے خوں مانگتی پناہوں میں
کٹا ہے جل گئے، خواب و خیال کا عرصہ

اُسے ملال رہا دورِ لاشعوری کا
یہاں ملال ہمیں اپنی باشعوری کا

۱۹ مارچ ۱۹۷۱ء

بنگال کا جادو

یہ لچکدار تھرکتی ہوئی کافر بدنی
سانس لیتے ہیں ایلورا و اجنتا جیسے
حسن وہ حسن کہ دیکھو تو پسینہ چھوٹے
ہر سیہ چشم لیے پھرتا ہے ہیرے کی کنی

ہائے کیا چیز ہے بنگال کی مٹی کا خمیر
عام ہے آخری حد سے بھی گزرنے کی ہوس
کوئی میدان سہی، پیرویٔ مور و مگس
جیسے موہوم ہے تسکینِ تمنا کی لکیر

یہ تو سب ٹھیک ہے لیکن یہ ادا کیسی ہے
دشمنِ جاں کہیں اپنوں ہی کو گردانتے ہیں
لوٹ جانے کو تو ہم مرگِ وفا جانتے ہیں
یہ تنفر یہ تعصب کی ہوا کیسی ہے

چشمِ نظّارہ کو وسعت دو سمندر دیکھو
اک ذرا خول سے باہر بھی نکل کر دیکھو

۲۳ر اگست ۷۰ ۱۹ء

ہمارے بعد

کہیں چراغ جلے ہم بنے رہے فانوس
اندھیری راتوں کا ہم لوگ کرب جانتے ہیں
کہ مہر و ماہ کو ذروں کا خواب مانتے ہیں
ہم ابتدا ہی سے کچھ روشنی سے تھے مانوس

ہمارے آگے کئی قافلے روانہ ہوئے
ہمارے پیچھے تو گرد و غبار ہے ایسا
نگاہ و دل پہ ابھرتا نہیں کوئی چہرہ
بگولے راہوں کے جیسے سبھی بہانہ ہوئے

ہمارے دور کے اے جاں گداز فنکارو
تمہارے فن کو تو ہم جیسے قدرداں بھی ملے
تمہارے درد کو کچھ غمگسار جاں بھی ملے
تم اپنے طور پہ خوش بخت ہی رہے یارو

دل و جگر کسے بخشیں، نظر کسے سونپیں
ہم اپنے بعد متاعِ ہنر کسے سونپیں

۱۷ر اکتوبر ۱۹۶۹ء

ناتراشیدہ پتا ہیں

(منّی کے نام)

میں نے سوچا تھا کہ حالات کے بازاروں سے
تیری آنکھوں کے لئے خواب خریدوں کوئی
جگمگاتا ہوا مہتاب خریدوں کوئی
نکہت و نور و خیالات کے بازاروں سے

سوچ مہتاب بھی اک خاک کا پیکر ہی تو ہے
جسکی مسکان ہے مانگے کے اجالے کی اسیر
اس کے ہاتھوں سے الگ ہے ترے ہاتھوں کی لکیر
خود کو انمول سمجھتا ہوا پتھر ہی تو ہے

تجھ کو یہ غم کہ ترا درد نہ سمجھا میں نے
اور جلتی ہوئی راہوں میں تجھے چھوڑ دیا
ناتراشیدہ پناہوں میں تجھے چھوڑ دیا
تجھ پہ کیا گزری پلٹ کر بھی نہ دیکھا میں نے

مجھکو امید ترے فن سے ہے ایسا ہو جائے
تو جو پتھر بھی تراشے تو وہ ہیرا ہو جائے

۲۹ر نومبر ۱۹۷۰ء

درد کا رشتہ

ہم تو اخلاص کے مارے ہیں دعا دیتے رہے
تم نے خود اپنے ہی ہاتھوں سے تو کھینچی ہے لکیر
تم نے خود اپنے دریچوں پہ چڑھا دی زنجیر
ہم وہ پاگل کہ تمہیں پھر بھی صدا دیتے رہے

تم نے کیں نامہ و پیغام کی راہیں مسدود
ہم تو اب تک بھی حکایاتِ جنوں لکھتے ہیں
تم کو اب تک وہی سامانِ سکوں لکھتے ہیں
درد اب تک نہ ہوا حرفِ تمنا آلود

پاسبانوں سے کہو پہرے اٹھا لیں اپنے
دل کے رشتوں پہ تو پابندیِ آداب نہ ہو
اپنی تعبیر سے شرمندہ کوئی خواب نہ ہو
اپنے ہی کاندھوں پہ کیا چہرے اٹھا لیں اپنے

اور کیا ظلم ابھی نامِ وفا لوٹے گا
تم سے اک درد کا رشتہ ہے سو کیا ٹوٹے گا

ارچنا

میں وہ سورج ہوں جلاتی ہے جسے اپنی ہی آگ
روز جل بجھتا ہوں موہوم سی اک آس لئے
شب کے دلدل میں اتر جاتا ہوں اک پیاس لئے
پھیل جاتی ہے افق پر مرے احساس کی آگ

تم سمندر ہو مگر اپنی ہی لہروں میں اسیر
موجزن ہو بھی تو ریتیلے کنارے نہ کٹیں
لاکھ چاہو بھی تو یہ درد کے دھارے نہ کٹیں
پھر وہی تھاہ تلک گہری خموشی کی لکیر

میں تہی جام بکف، تشنہ دہن ہوں کب سے
تم چھلکتی ہوئی مے ہو کہ نہ پیکھی جائے
اور اسی آس میں جیتے ہو کوئی پی جائے
میں سلگتے ہوئے احساس کا بن ہوں کب سے

تابیے بکھروں میں کرنوں کا مقدر ہو کر
تم بھی اک قطرۂ شبنم ہو، سمندر ہو کر

۲۰؍اگست ۱۹۷۰ء

شاعر

عجیب فلسفہ شاعر کی زندگی کا ہے
کبھی تو ڈھونڈے ہے اندھے کنویں میں چاہ کا نور
ہے خود سپردگیِ مہر و ماہ نا منظور
کبھی تو حادثۂ سخت جاں کبھی پھیکا ہے

اُجالتا ہے اندھیروں کو اپنے زخموں سے
تمام دن جو اجالوں کا زہر پیتا ہے
سکونِ دیدۂ بے خواب بن کے جیتا ہے
وہ لے کے جاگتی آنکھوں کے خواب لوگوں سے

کبھی تو ہے وہ لہو روتے قہقہوں کا شریک
خلوصِ دل سے کبھی جشنِ غم مناتا ہے
کوئی خیال ہو رگ رگ میں سنسناتا ہے
قلم کو یوں ہی نہیں ہوتی دوستو تحریک

جو حرف چمکتے ہیں درد کے جگنو،
ٹپکتا رہتا ہے آنکھوں سے قطرہ قطرہ لہو،

وہ عکسِ بے بہا

ایک ایک حرف آئینہ در آئینہ ہوا
ایک ایک لفظ تھا کئی چہرے لئے ہوئے
آہنگ، راگ، رنگ کے لہرے لئے ہوئے
ایک ایک خطِ خوش ہنری بولتا ہوا

وہ شخص تھا بجائے خود اک محشرِ خیال
کیا کیا نہ دعویٰ ہنر خوب اس سے تھا
سچ پوچھئے تو شعر کا اسلوب اس سے تھا
اب تک عروج پہ ہے وہی فکرِ لازوال

ہر لفظ اک ہجوم معانی میں گھر گیا
ہر چند حسن بحر بہت جزر و مد پہ تھا
لیکن سمٹ سمٹ کے بکھرنے کی حد پہ تھا
وہ خسروِ جزیرہ کہ پانی میں گھر گیا

اسکا شمار آج بھی خوش قامتوں میں ہے
وہ عکسِ بے بہا تو مرے آئینوں میں ہے

۲۹ر نومبر ۷۳ء

قیدِ حیات

وہ زندگی جو کسی دستِ خوش اماں سے ملی
ادھورے خواب ادھورے خیال چھوڑ گئی
دل و دماغ میں جلتے سوال چھوڑ گئی
زمینِ درد کہاں جا کے آسماں سے ملی

سزائے مرگ سے بدتر ہے حکمِ جبرِ حیات
خود اپنے آپ سے ملنے کو وقت بھی نہ ملے
جہاں کہ خواب بھی دیکھو تو زندگی نہ ملے
ہے بے دریچہ و بے چہرہ کتنی قبرِ حیات

شفق کا رنگ بھی اب ہے سفید اس کے لئے
بکھر گیا تھا جواں زندگی کا خوابِ وفا
بہت تھی جسکے لئے دل کے ٹوٹنے کی سزا
زیادتی ہی تو ہے عمرِ قید اسکے لئے

بہت اداس ہے وہ چشمِ سُرمئی جیسے
بھری بہار میں بینائی چھن گئی جیسے

ترائیلے

No Man's Land.

یہ تمہاری کوکھ سے جنما نہیں ہے
اس سے اپنا کیا کوئی رشتہ نہیں ہے؟
یہ ہمارے ہاتھ کا لکھا نہیں ہے
یہ تمہاری کوکھ سے جنما نہیں ہے
اسکا ہونا پھر کبھی کیا ہونا نہیں ہے
اس کی ماں بے شک کوئی سیتا نہیں ہے
یہ تمہاری کوکھ سے جنما نہیں ہے
اس سے اپنا کیا کوئی رشتہ نہیں ہے

Hijaking

یہ کس بدن میں اتارا گیا مجھے لا کے
یہ کون مجھ میں چھپا تھا حریف نا محسوس
بنے تھے کیا کیا نہ میں نے حیات کے خاکے
یہ کس بدن میں اتارا گیا مجھے لا کے
یہ کون ہے جو مجھے یرغمال ٹھہرا کے
ہوا ہے میری طرح اپنے آپ سے مایوس
یہ کس بدن میں اتارا گیا مجھے لا کے
یہ کون مجھ میں چھپا تھا حریف نا محسوس

Hostile Witness.

اُسی سے آس تھی جو ہے گواہِ برگشتہ
میں بے گناہ تو انصاف کا شکار بھی تھا
نہ جانے کس لئے سچائی سے گریزاں تھا
اُسی سے آس تھی جو ہے گواہِ برگشتہ
اُسے معاف کیا میں نے خوں بہا اپنا
ہزار کچھ سہی وہ شخص اپنا یار بھی تھا
اسی سے آس تھی جو ہے گواہِ برگشتہ
میں بے گناہ تو انصاف کا شکار بھی تھا

Hang-over.

سنپولا دودھ پیتے پیتے اک دن
لہو انسان کا پینے لگا تھا
لہو کا نشہ زہریلا تھا لیکن
سنپولا دودھ پیتے پیتے اک دن
جو پہنچا ناسوادِ حد ممکن
سوا نیزے پہ سورج آگیا تھا
سنپولا دودھ پیتے پیتے اک دن
لہو انسان کا پینے لگا تھا

Cul de Sac.

میں عمر و عشق کی اس رہگذر میں ایک ہی ہوں
یہ جانتے ہوئے آگے ہے راستہ مسدود
میں ہار جیت کا قائل ہوں صُلح کیسے کروں
میں عمر و عشق کی اس رہگذر میں ایک ہی ہوں
جہاں سے لوٹنا چاہوں تو لوٹ بھی نہ سکوں
نفس کی ڈور ہے سلگی ہوئی، بدن بارود
میں عمر و عشق کی اس رہگذر میں ایک ہی ہوں
یہ جانتے ہوئے آگے ہے راستہ مسدود

Ring Master.

"نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن"
کہ ہم تو سرکس کے جانور ہیں
اشارۂ تازیانہ سہے فن
"نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن"
یہ سب ریاکاریوں کا مامن
یہ ہم اداکار بے ہنر ہیں
"نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن"
کہ ہم تو سرکس کے جانور ہیں

Gambit.

وہ پھر ایک شیرے کا قطرہ ہے دیوار پر
وہ پھر اس کی جانب کھسکتی ہوئی چھپکلی
جھپٹتی وہ بلّی شکارِ نمودار پر
وہ پھر ایک شیرے کا قطرہ ہے دیوار پر
وہ بلّی پہ غراتا کتا گرا جار پر
لگا شہر میں کرفیو، ایک بھگدڑ مچی
وہ پھر ایک شیرے کا قطرہ ہے دیوار پر
وہ پھر اس کی جانب کھسکتی ہوئی چھپکلی

Resgesta.

بے گناہوں کو سزا دینی پڑی ہے
ہم بھی کن ہاتھوں کے پتھر ہو گئے ہیں
کیا اذیت ہے جو سہہ لینی پڑی ہے
بے گناہوں کو سزا دینی پڑی ہے
ناؤ منجدھاروں میں بھی کھینی پڑی ہے
ہم ہوا، لنگر، سمندر ہو گئے ہیں
بے گناہوں کو سزا دینی پڑی ہے
ہم بھی کن ہاتھوں کے پتھر ہو گئے ہیں

I am not a Reserved Player.

سب سمجھتا ہوں، کوئی بچہ نہیں
میں ڈرامے کا اہم کردار ہوں
میرے آگے پیچھے اب کیا کیا نہیں
سب سمجھتا ہوں، کوئی بچہ نہیں
کار کا میں پانچواں پہیّہ نہیں
جیت ہوں اپنی جگہ یا ہار ہوں
سب سمجھتا ہوں، کوئی بچّہ نہیں
میں ڈرامے کا اہم کردار ہوں

Limbo.

میں جہاں ہوں وہاں اوس و خزرج بھی ہیں
ایک آوازِ حق بھی، سمیّہ بھی ہے
گھر کے آنگن ابوجہل کے کج بھی ہیں
میں جہاں ہوں وہاں اوس و خزرج بھی ہیں
چور، زانی، شرابی بھی ہیں زنج بھی ہیں
میں ہوں سب سے الگ سب سے رشتہ بھی ہے
میں جہاں ہوں وہاں اوس و خزرج بھی ہیں
ایک آوازِ حق بھی، سمیّہ بھی ہے

Doctor's Dilemma.

ہم پھر قریب آکے بہت دور ہو گئے
تم میں جو ہے وہ اپنی انا کا شکار ہے
میں نار ہو گیا ہوں کہ تم نور ہو گئے
ہم پھر قریب آکے بہت دور ہو گئے
مجھ میں ہزار طرح کے ناسور ہو گئے
مجھ سے پرے رہو یہ تمہیں اختیار ہے
ہم پھر قریب آکے بہت دور ہو گئے
تم میں جو ہے وہ اپنی انا کا شکار ہے

Waste Control.

مجھے گھر لوٹ جانا چاہیئے تھا
(مگر اب لوٹ کر بھی کیا کروں گا؟)
یہی نا آب و دانہ چاہیئے تھا
مجھے گھر لوٹ جانا چاہیئے تھا

تھکن میں کچھ ٹھکانا چاہیئے تھا
کہیں سائے میں رک جایا کروں گا
مجھے گھر لوٹ جانا چاہیئے تھا
(مگر اب لوٹ کر بھی کیا کروں گا؟)

"کارِ جہاں دراز ہے"

آدمی برسرِ بغاوت ہے
قعرِ ارذل سے قصرِ احسن تک
فاصلہ یوں تو بے نہایت ہے
آدمی برسرِ بغاوت ہے
سر سے پا تک جوازِ محنت ہے
من و سلویٰ سے پیاز لہسن تک
آدمی برسرِ بغاوت ہے
قعرِ ارذل سے قصرِ احسن تک

"کوہِ ندا"

آج لو پھر وہ دس بج گئے
ہم چلے دفتروں کی طرف
بدحواسی میں ہم سج گئے
آج لو پھر وہ دس بج گئے
خواب دیکھنے پہ تج گئے

پھر نہ دیکھا گھروں کی طرف
آج لو پھر وہ دس بج گئے
ہم چلے دفتروں کی طرف

تتلی

کچے رنگوں سے بنائی ہوئی تصویر ہے تو
مجھکو یہ ضد کہ ترے لمس کی لذت بھی ملے
ایک دیوار پہ لکھی ہوئی تحریر ہے تو
کچے رنگوں سے بنائی ہوئی تصویر ہے تو
کوئی تتلی ہے کہ بیگانۂ تعمیر ہے تو
رنگ ہی رنگ کروں کیا تری صورت بھی ملے
کچے رنگوں سے بنائی ہوئی تصویر ہے تو
مجھکو یہ ضد کہ ترے لمس کی لذت بھی ملے

ارتکاز

لہو کا بہنا تو ہے ارتکازِ جاں کی نفی
لہو جمے تو کہیں کوئی شکل ابھرے گی
ثباتِ حرف یقیں ہو تو ہو گماں کی نفی
لہو کا بہنا تو ہے ارتکازِ جاں کی نفی
تجربہ آئے کہیں سے ہوئی زیاں کی نفی
سواری خیمۂ گل میں کسی کی ٹھہرے گی
لہو کا بہنا تو ہے ارتکازِ جاں کی نفی
لہو جمے تو کہیں کوئی شکل ابھرے گی

۲۰ اکتوبر ۱۹۶۸ء

امانت

اپنا کردار ترے قرب کے لمحوں کیلئے
اک امانت کی طرح میں نے اٹھا رکھا ہے
پیاس اک عمر کی ترسے تری آنکھوں کیلئے
اپنا کردار ترے قرب کے لمحوں کیلئے
تیرے ہونٹوں ترے رخسار کے صفحوں کیلئے
ایک ایک قطرۂ جاں میں نے بچا رکھا ہے
اپنا کردار ترے قرب کے لمحوں کیلئے
اک امانت کیطرح میں نے اٹھا رکھا ہے

حالات

حالات خود بھی میرے موافق نہ تھے ابھی
تم سے بھی انتظار کی زحمت نہ ہو سکی
دل اتنی آرزوؤں کے خالق نہ تھے ابھی
حالات خود بھی میرے موافق نہ تھے ابھی
لمحے تمہارے قرب کے لائق نہ تھے ابھی
اظہار آرزو کی جو جراءت نہ ہو سکی
حالات خود بھی میرے موافق نہ تھے ابھی
تم سے بھی انتظار کی زحمت نہ ہو سکی

انجام کار

سوچا ہے تیری مانگ میں سیندور دیکھ کر
اپنی ہتھیلیوں کی لکیروں کو میٹ لوں
غارِ حرائے زیست کو بے نور دیکھ کر
سوچا ہے تیری مانگ میں سیندور دیکھ کر
کربِ وفا کو ضبط پہ مجبور دیکھ کر
تسکین مانگتی ہوئی نظریں سمیٹ لوں
سوچا ہے تیری مانگ میں سیندور دیکھ کر
اپنی ہتھیلیوں کی لکیروں کو میٹ لوں

دیوار

(اپنے اکلوتے بھائی کے نام)

ایک ہی چھت کے تلے رہنا جو چھوٹا اپنا
ایک ہی شہر میں رہتے ہیں نہ رہنے کی طرح
اتنا بودا تو نہ تھا خون کا رشتہ اپنا
ایک ہی چھت کے تلے رہنا جو چھوٹا اپنا
اپنی اپنی ہے خوشی، درد ہے اپنا اپنا
ہم ہوئے شاخ سے ٹوٹے ہوئے پتے کی طرح
ایک ہی چھت کے تلے رہنا جو چھوٹا اپنا
ایک ہی شہر میں رہتے ہیں نہ رہنے کی طرح